بعض تو لکھے پڑھے ہیں خواہ اردو ہی میں لکھے پڑھے ہوں اور بعض ان پڑھ ہیں پہلے طبقہ کے لئے تو تحقیق حق کا طریقہ یہ ہے کہ وہ سب علماء کی کتابیں دیکھیں۔ مگر دونوں کے علماء کی کتابیں خالی الذہن ہو کر انصاف سے دیکھیں۔ پہلے سے کسی کی طرفداری اور حمایت کا خیال دل میں نہ لائیں کیونکہ اعتقاد کے بعد اس کی ہر بات اچھی معلوم ہوگی اور عیب نظر نہ آئے گا۔ سو تحقیق حق کا یہ طریقہ نہیں بلکہ اس کا طریقہ یہی ہے کہ خالی الذہن ہو کر دونوں کی کتابوں کا مطالعہ انصاف کے ساتھ کیا جائے۔ خدا کے ساتھ معاملہ ہے۔ اس کو پیش نظر رکھ کر دیکھنا چاہیئے انشاء اللہ تعالیٰ اگر طلب حق ہے تو بہت جلد آپ کے ذہن میں خود بخود حق واضح ہو جائے گا۔ جب ایک کا حق ہونا معلوم ہو جائے تو بس اسی سے تعلق رکھو۔ اور اسی سے دین کی باتیں اور خدا کا راستہ دریافت کرو۔ مگر دوسرے کو بھی برا نہ کہو کیوں کہ کسی کا برا کہنے سے تمہارا کیا بھلا ہو جائے گا بس تم اپنی یہ حالت رکھو ؎

؎ ہمہ شہر پر ز خوباں منم و خیال ما ہے۔
چہ کنم کہ چشم بدخو نہ کرد بکس نگا ہے۔

دل آرامیکہ داری دل درو بند
دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

اگر کوئی برا بھی ہو تو تم اس کو برا نہ کہو۔ وہ اگر برا ہے۔ تو تم کو کیا۔ اور اگر دوسرا تم کو برا کہے جب بھی تم اسے برا نہ کہو۔ ذوق نے خوب کہا ہے ؎

تو بھلا ہے تو برا ہو نہیں سکتا اے ذوق ؛ ہے برا وہی کہ جو تجھ کو برا جانتا ہے
اگر تو ہی برا ہے تو وہ سچ کہتا ہے۔ ؛ پھر برا کہنے سے کیوں اسکے برا مانتا ہے

مولویوں کی صحبت میں رہ کر دیکھے

یہ طریقہ تو پڑھے لکھوں کے واسطے ہے اور جو بے پڑھے ہوں وہ یہ کریں کہ دو مولویوں کے پاس جا کر ایک ایک ہفتہ رہیں اور جو وقت ان کی فرصت کا ہو دریافت کرنے سے معلوم ہو جائے گا اسمیں ان کے پاس بیٹھیں اور ان کی باتیں سنیں اور دیکھیں جو مسائل متفق علیہ ہیں ان کی پابندی کا کس کو زیادہ اہتمام ہے اور نیز یہ کہ کس کے پاس جا کر کیا اثر ہوتا ہے۔ اگر کسی کے پاس جا کر آخرت کی رغبت پیدا ہو عبادت الٰہی کا شوق بڑھے اور خدا کی نافرمانی سے دل میں نفرت اور خوف پیدا ہو۔ اور اس کے پاس رہنے والوں کی زیادہ تر حالت اچھی ہو تو

بس اس کو اختیار کرلیں۔ اسی سے ہر بات پوچھا کریں اور اس کی صحبت میں گاہے گاہے آیا جایا کریں اور یہ طریقہ پڑھے لکھوں کو بھی بہت مفید ہے۔ محض کتابوں کے مطالعہ سے کسی عالم کی اصلی حالت ایسی نہیں معلوم ہوتی۔ جیسے پاس رہنے سے معلوم ہوتی ہے۔ اسلئے وہ بھی اگر یہ طریقہ اختیار کریں تو زیادہ بہتر ہے۔ (اسباب الفتنہ ص۵۷)

(۷۸) بعض لوگ کہتے ہیں کہ روزے صرف تین ہی ہونے چاہئیں، اس کی تردید!

ایک اشتہار میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ روزے صرف تین ہی ہونے چاہئیں۔ یعنی گیارہویں۔ بارہویں۔ تیرہویں۔ اور اس پر دلیل کیا خوب صورت لائے۔ اس کو بھی سنیئے۔ آپ نے یوں استدلال کیا کہ روزے کے بارے میں قرآن میں آیا ہے أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ۔ یعنی چند روز۔ جس کا اصلی مطلب تو یہ ہے کہ ہماری ہمت بڑھانے کے لئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ روزہ کے تھوڑے ہی دن میں۔ گھبراؤ نہیں۔ مگر آپ نے اس میں یہ اجتہاد کیا کہ حج کے بارہ میں بھی یہی لفظ آیا ہے۔ ایاما معدودات اور وہاں ایاما معدودات سے یہی گیارہویں، بارہویں۔ تیرہویں۔ تاریخیں مراد ہیں۔ جب وہاں حج میں ایاما معدودات سے یہ مراد ہیں تو یہاں صوم میں بھی وہی مراد ہیں۔ کیونکہ۔ القرآن یفسر بعضہ بعضاً۔ حالانکہ القرآن یفسر بعضہ بعضا کے قاعدہ سے وہاں کام لیا جاتا ہے جہاں ایک آیت کی تفسیر معلوم اور دوسرے کی تفسیر معلوم نہ ہو۔ اور یہاں تو دونوں کی تفسیر الگ الگ معلوم ہے مگر اس اندھے نے تو ایک جگہ کی تفسیر لے لی اور دوسری جگہ کی تفسیر نظر انداز کردی میں کہتا ہوں کہ اگر ایاما معدودات سے بقرینہ دوسری آیت کے گیارہویں، بارہویں، تیرہویں، مراد ہوں تو یہ تاریخیں تو ذی الحجہ کا روزہ رکھنا قرآن سے۔ گیارہویں۔ بارہویں، تیرہویں ذی الحجہ کا روزہ رکھنا قرآن سے ثابت ہوگا اور یہ ہیں ایام تشریق۔ ان میں روزہ رکھنا اجماعاً بالکل حرام ہے تو قرآن سے ایسے ایام کا روزہ رکھنا فرض ہوگا جس کا روزہ رکھنا اجماعاً بالکل حرام ہے۔ اچھا اجتہاد کیا۔ اور نیز میں کہتا ہوں کہ اگر ہر جگہ ایاما معدودات سے یہی گیارہویں، بارہویں۔ تیرہویں۔

مراد ہیں تو یہود نے جو کہا ہے لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّا اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ کہ ہم کو دوزخ میں تھوڑے
دن رہنا پڑے گا تو کیا وہاں بھی تین ہی دن مراد ہیں۔ ایمان سے کوئی بتلادے کہ کیا یہود کی بھی
مراد تھی کہ فقط گیارہویں۔ بارہویں، تیرہویں کو دوزخ میں رہنا پڑے گا۔ اور وہ بھی ذی الحجہ
ہی ہیں۔ اگر یہاں بھی یہی مراد ہے تو یہ ایسا ہوا کہ جو کالا وہی میرے باپ کا سالا۔ غرض اسی طرح
لوگوں نے فتنے ایجاد کئے ہیں کوئی کہاں تک ان کا انسداد کرے بغیر حکومت کے ہو نہیں سکتا
کوئی سلطنت اسلام کی ہوتی وہ ان کو بند کرتی۔ (احیاء الصیام من عیز الانصرام حصہ اول صہ ۹)

۷۹) اس شبہ کا جواب کہ تبلیغ عذر سے ساقط ہوتی ہے یا نہیں

اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے آپ امر بالمعروف شروع کر دیں جب کام شروع کر کے کہیں
گاڑی اٹکے گی اس وقت استفتاء کر لینا ابھی سے اعذار کے حکم دریافت کرنے کا آپ کو حق
نہیں۔ بلکہ اس وقت اعذار کا حکم دریافت کرنا گویا جان بچانے کی تدبیریں ڈھونڈنا ہے۔ سب
مسلمان جانتے ہیں کہ شریعت نے طاقت سے زیادہ کوئی حکم نہیں دیا۔ مگر پھر بھی اس قسم
کے عذر کو دوسرے کاموں کی بابت کوئی پیش نہیں کرتا۔ مثلاً وضو بعض دفعہ عذر سے ساقط
ہوجاتا ہے اور نماز میں قیام عذر سے ساقط ہوجاتا ہے مگر جس وقت نماز کے لئے کسی کو کہا
جاتا ہے۔ وہ کبھی یہ نہیں کہتا کہ پہلے مجھے یہ بتلادو کہ وضو اور قیام کن کن عذروں سے ساقط
ہوجاتا ہے کیونکہ وہاں آپ نماز کے پڑھنے کو ضروری سمجھتے ہیں اور عذر کو عارضی۔ اسی طرح
کھانے میں بھی کسی نے طبیب سے یہ نہیں پوچھا کہ حکیم جی کھانے کے شرائط بتلادو۔ اور یہ بھی
سمجھا دو کہ کس وقت چھوڑ دیا جائے کیونکہ یہاں بھی کھانے کو ضروری اور نہ کھانے کو عارضی
سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح رمضان میں جو لوگ روزہ رکھتے ہیں وہ کبھی پہلے یہ نہیں پوچھتے
کہ مولوی صاحب روزہ کن کن وجوہ سے ساقط ہوجاتا ہے بلکہ کوئی اگر ایسا سوال کرے
تو اس کی نسبت عام طور پر یہ بدگمانی ہوتی ہے کہ شاید روزہ نہ رکھنے کے ارادے ہیں۔ صاحب
آپ کو چاہئے تھا کہ آپ امر بالمعروف شروع کرتے پھر کسی وقت یا وجاہت آدمی کو خلاف

شرع وضع پر نصیحت کرنے یا کافر کو تبلیغ اسلام کرنے میں گاڑی اٹکتی اس وقت مولوی صاحب
سے پوچھتے کہ اس موقع پر کیا کروں یہ کیا کہ آپ نہ حاکم کو امر بالمعروف کریں۔ نہ محکوم کو، نہ مسلم کو
نہ کافر کو۔ نہ بیوی کو۔ نہ اولاد کو، اور پہلے ہی سے لگے عذر کا حکم دریافت کرنے۔ شاید آپ
یہ کہیں کہ نماز روزہ میں تو عذر کم پیش آتے ہیں اور امر بالمعروف میں تو اکثر پیش آتے رہتے
ہیں میں کہتا ہوں کہ یہ خیال غلط ہے۔ اپنے گھر والوں کو امر بالمعروف کرنے میں کون سا عذر مانع
ہے۔ بیوی نے نماز نہ پڑھی تھی اس کو نصیحت کرتے میں کیا خوف تھا کیا وہ آپ کو مار ڈالیگی
یا لڑکا نماز نہیں پڑھتا تو وہ آپ کا کیا کرے گا اگر آپ کہیں کہ وہ سنتا نہیں ہے۔ تو میں کہتا ہوں
کہ اگر وہ کبھی امتحان میں فیل ہوجائے تو اس وقت اس کو کیوں مارتے ہیں اور کیوں سزا دیتے
ہیں۔ اس وقت وہ آپ کی بات کیونکر سننے لگتا ہے۔ پس یہ سب بہانے لغو ہیں۔ اصل
بات وہی ہے کہ آپ اس کو ضروری ہی نہیں سمجھتے بھلا اگر آپ کا کوئی دوست آپ کے سامنے
زہر کھانے لگے تو کیا آپ اس کو نہیں روکیں گے یقیناً ہاتھ پکڑ کر زور سے جھٹکا دیکر زہر کو
اس کے ہاتھ سے لے لیں گے اگر تنہا قادر نہ ہوں گے تو دوسروں کو امداد کے واسطے
بلائیں گے۔ پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ دین میں جو افعال مضر ہیں ان کے روکنے میں اس اہتمام
سے کام نہیں لیا جاتا۔ معلوم ہوا کہ آپ دین کے ضرر کو ضرر نہیں سمجھتے اور یہ سخت مرض ہے
جس کا علاج بالضد ہے۔ مگر افسوس اس قدر غفلت ہے کہ خدا کی پناہ کسی کو بھی اس مرض
کے علاج کی طرف توجہ نہیں۔ الا ماشاء اللہ۔

(تواصی بالحق حصہ اول)

(۸۰) تبلیغ اسلام کا اسلم طریقہ

ہر ضلع میں ایک مجلس تبلیغ قائم کر دی جاوے جس کا نام وغیرہ رکھنے کی کوئی ضرورت
نہیں۔ نہ عہدہ داروں کے نام مقرر کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ آجکل انجمن کے قوانین
اور عہدہ داروں کی فہرست میں تو رجسٹر سیاہ کئے جاتے ہیں۔ مگر کام نہیں ہوتا۔ ہم
کو کام کرنا چاہئے جتنا جس سے ہوسکے بڑے پیمانہ کی بھی فکر نہ کرو چھوٹے ہی پیمانہ پر کام
شروع کردو۔ ہماری حالت یہ ہے کہ یا تو کام کرتے ہیں ٹیپ ٹاپ سے ورنہ کچھ نہیں کرتے

وہی مثل ہے۔ کھاؤں گا تو گھی سے ورنہ جاؤں گا تو جی سے۔ یہ بڑی حماقت اور غلطی ہے یاد
رکھو ابتدا ہر کام کی کمزور اور معمولی ہوتی ہے ترقی تدریجًا ہی ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ نے اس عالم
میں اپنے افعال کو بھی تدریجًا ہی ظاہر کیا ہے کہ اول نطفہ قرار پاتا ہے پھر نو ماہ کے بعد پیدا
ہوتا ہے پھر رفتہ رفتہ نشوونما ہو کر پندرہ برس میں لڑکا بالغ ہوجاتا ہے حالانکہ حق تعالیٰ قادر
ہیں کہ ایک ہی منٹ میں سب کچھ کر دیں۔ جیسا کہ جنت میں ہوگا۔ کہ جس شخص کو وہاں اولاد کی
تمنا ہوگی تو بیوی کے پاس جاتے ہی حمل قرار پاکر فورًا بچہ پیدا ہوگا اور اسی وقت باپ
کے برابر ہو جائے گا خدا تعالیٰ کا اس عالم میں یہ نمونہ ظاہر نہ کرنا اور تدریجًا افعال ظاہر کرنا ہماری
تعلیم ہی کے لئے تو ہے کہ تم دنیا میں ابتداء عمل کے ساتھ ہی ترقی و عروج کے طالب
نہ ہو۔ بلکہ چھوٹے پیمانے ہی پر کام شروع کر دو۔ اور اس میں لگے رہو۔ رفتہ رفتہ
ایک دن عروج و کمال بھی حاصل ہو جائے گا۔ تم سے جتنا کام ہو سکتا ہے اتنا ہی کرنے
لگو۔ تم اسی کے مکلّف ہو۔ اس سے زیادہ کے مکلف نہیں حق تعالیٰ اسی میں برکت دیں گے
انجمن کا نام کرنے اور عہدہ داروں کے مقرر کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ نہ اشتہاروں در
اخباروں میں چھاپنے سے کچھ ہوتا ہے۔ فائدہ کام کرنے سے ہوتا ہے چاہے تھوڑا ہی ہو
تو دو چار آدمی ہی مل کر تبلیغ شروع کر دو۔ اور اپنی قلت پر نظر نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ نے
ایک ذات پاک کے ذریعہ سے اسلام کو عرب سے تمام دنیا میں پہونچایا ہے سو وہ خدا
اب بھی موجود ہے تم اسی پر بھروسہ کر کے کام شروع کر دو۔

صحابہؓ کی مثال

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرات صحابہؓ کی مثال قرآن میں یوں بیان
فرمائی ہے۔ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ
فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ
کہ ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بیج زمین میں بو دیا جائے تو اول وہ اپنی سوئی، کو
نکالتا ہے پھر خدا اس کو پانی ہوا مٹی وغیرہ سے قوت دیتا ہے تو قوی . . . . مضبوط
ہو کر تنہ دار سیدھا درخت ہوجاتا ہے۔ سو آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک ذرا سا بیج
سے کتنا بڑا درخت پھیلتا ہے جو سارے محلہ پر سایہ افگن ہوتا ہے۔ جب جمادات
میں ادنیٰ تخم کی یہ حالت ہے تو انسانوں میں ایک دو آدمی اللہ کے بھروسہ پر کام کریں
اور ان کے کام کو قوت و ترقی حاصل ہو جائے تو کیا بعید ہے مگر آجکل مشکل یہ ہے کہ

کام تو شروع نہیں ہوتا اور پہلے ہی سے گیدڑی دوڑتی ہے کہ اس تجویز کو اخباروں میں
شائع کرا دیں۔ اشتہار چھپوا دیں۔ صاحبو! کیا یہ ریا نہیں۔ اور کیا ریا وغیرہ سے ممانعت
نہیں اور وہ ممانعت کس کے لئے ہے؟ کیا یہ احکام کفار کے واسطے نہیں؟ ہرگز نہیں۔
بلکہ مسلمانوں ہی کو ریا وغیرہ سے منع کیا گیا ہے۔ کیونکہ کفار مخاطب بالفروع نہیں ہیں۔
بعض اس پر یہ کہا کرتے ہیں کہ ہم اخبارات و اشتہارات کے ذریعہ سے اظہار اسلئے
کرتے ہیں کہ دوسروں کو بھی اس سے ترغیب ہوگی۔ م
میاں بس رہنے دو۔ یہ تو تاویل ہی تاویل ہے ذرا دل کو ٹٹول کر دیکھو تو معلوم ہوگا
بجز شہرت اور نام کے کچھ مقصود نہیں۔ اگر کسی کی واقعی غرض ترغیب ہی کی ہو۔ جب بھی
اس کو چاہیئے کہ اس اشاعت کے اشتہار کے متعلق اول کسی عالم محقق بے غرض سے مشورہ
لے۔ (تواصی بالحق حصہ اوّل ص۴۲)

۸۱) مجتہدین کے اختلاف کا راز۔

سنن میں امتیاز کرنا کہ شارع کے نزدیک مقصود کون ہے۔ اور غیر مقصود کون ہے
کام مجتہدین کا ہے ہر شخص کا کام نہیں۔ اور کبھی اجتہاد میں اختلاف بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ حضور
صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز میں رفع یدین ثابت ہے اور عدم رفع بھی ثابت ہے اب یہاں
مجتہدین کا اختلاف ہوا۔ ایک مجتہد سمجھے، کہ رفع یدین مقصود ہے اور ترک رفع آپ
نے جو فرمایا تو بیانِ جواز کے لئے ہے۔ مقصود نہیں۔ اور ایک مجتہد جو عدمِ رفع کے قائل
ہیں وہ کہتے ہیں کہ نماز میں سکون چاہیئے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم
نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا۔ کہ یہ تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ تم نماز میں ہاتھ اٹھاتے ہو۔ (یعنی
نماز کے وقت) نماز میں سکون اختیار کرو۔ پس مقصود عدم رفع ہے اور رفع بیان جواز
کے لئے فرمایا۔ اور جنہوں نے رفع کو مقصود سمجھا ہے تو وہ اس میں یوں کہتے ہیں کہ یہ
رفع جس سے منع فرمایا۔ یہ وہ نہیں ہے جو رکوع میں جانے اور اس سے اٹھنے کے وقت
کیا جاتا ہے بلکہ یہ وہ رفع ہے جو کہ سلام پھیرتے وقت کیا جاتا ہے۔ جیسا بعض حدیثوں میں
اس کی تشریح ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم جب نماز کا سلام پھیرتے تو ہاتھ اٹھا کر کہتے السلام

علیکم ورحمۃ اللہ یہ ممانعت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر فرمائی۔ ہم اس بارے میں یوں کہتے ہیں کہ مانا اس رفع سے وہی رفع مراد ہے مگر اس سے ایک بات تو ضرور نکلی کہ اصل مطلوب نماز میں سکون ہے اور رفع اس کے خلاف ہے۔ پس مواقع مختلف فیہا میں بھی رفع مقصود نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ نماز کی حالت اصلی یعنی سکون کے خلاف ہے۔ اور عدم رفع چونکہ سکون کے موافق ہے اس لئے وہ مقصود ہوگا۔ اسی طرح اور جہاں کہیں اختلاف ہوا ہے اسی وجہ سے ہوا ہے کہ ایک نے ایک چیز کو مقصود سمجھا اور ایک نے دوسری چیز کو۔

آمین میں اختلاف

مثلاً۔ آمین کہنا۔ ایک مجتہد کی رائے یہ ہے کہ مقصود آمین پکار کر کہنا۔ اور اخفاء جو ہوا ہے تو وہ بیان جواز کے لئے۔ اور ایک مجتہد کی رائے ہے کہ مقصود اخفاء ہے کیونکہ یہ دعاء ہے اور دعا میں اخفاء مقصود ہے اگر پکار کر کبھی کہہ دیا ہے تو وہ اس لئے تاکہ معلوم ہو جائے کہ آپ آمین بھی کہا کرتے ہیں اگر کبھی کبھی پکار کر نہ کہتے تو خبر نہ ہوتی کہ آمین بھی آپ کہا کرتے ہیں جیسے کبھی کبھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حکمت کے لئے سری نماز میں ایک آیت پکار کر پڑھ دی ہے تعلیم کی غرض سے ایک مجتہد کی رائے یہ ہے اور ایک کی وہ رائے ہے یہ اختلاف کاہے سے ہوا۔ اسی وجہ سے کہ ایک نے ایک چیز کو مقصود سمجھا اور دوسرے نے دوسری چیز کو۔ اگر اس کو پیش نظر رکھا جائے تو آپس میں لڑائی جھگڑے ہی کا خاتمہ ہو جائے۔ بس یہ راز ہے اختلاف مجتہدین کا۔ اسی بناء پر تمام افعال میں اختلاف ہوا ہے۔

(احکام المال صہ ۳۳)

(۸۲) درود ابراہیمی علیہ السلام کے افضل ہونیکا شبہ اور اس کا جواب۔

ایک مشہور سوال کا حل یہ ہے کہ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ

کما صلیت علی ابراھیم وعلی اٰل ابراھیم میں جو صلوٰۃ علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صلوٰۃ علی ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے تو اس پر بعض لوگوں کو شبہ ہوتا ہے۔ صلوٰۃ ابراہیمیہؑ کے افضل و اکمل ہونیکا صلوٰۃ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم سے۔ اور منشا اس کا وہی ہے کہ عام طور پر لوگوں نے یہی سمجھ رکھا ہے کہ تشبیہ میں مشبہ بہ کا مشبہ سے اقویٰ و اکمل ہونا شرط ہے حالانکہ یہ مقدمہ ہی غلط ہے۔ بلکہ صرف اوضح اور اشہر ہونا ضروری ہے افضل و اکمل ہونا ضروری نہیں اور اس کی دلیل خود قرآن میں موجود ہے فرماتے ہیں۔ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نور کو چراغ کے نور سے تشبیہ دی ہے حالانکہ چراغ کے نور کو نور حق سے کیا نسبت مگر بوجہ وضوح کے تشبیہ دی گئی ہے۔ کیونکہ نور مصباح لوگوں کے ذہن پہلے سے حاضر ہے۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

اس پر اگر یہ سوال ہو کہ لوگوں کے ذہن میں تو نور شمس[1] و قمر بھی حاضر ہے اور ان دونوں کا نور چراغ کے نور سے زیادہ قوی ہے تو ان کے ساتھ تشبیہ کیوں نہیں دی گئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سورج اور چاند کا نور اگرچہ چراغ کے نور سے اقویٰ ہے مگر سورج میں ایک عیب یہ ہے کہ اس پر نگاہ نہیں جمتی۔ اس کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے تو سامعین کو شبہ ہوتا کہ شاید خدا کا نور بھی ایسا ہی ہوگا اس پر نگاہ نہ جم سکے تو جنت میں بھی دیدار سے مایوسی ہوئی اور قمر سے اس لئے تشبیہ نہیں دی کہ اس کے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ نور القمر مستفاد من نور الشمس تو اس کے ساتھ تشبیہ دینے میں اس کا شبہ ہوتا کہ نور حق بھی کسی سے مستفاد ہے پھر چراغ میں ایک صفت شمس و قمر سے زیادہ یہ ہے کہ وہ دوسروں کو بھی منور[2] بنا دیتا ہے کہ ایک گھنٹہ میں ایک چراغ سے ایک لاکھ چراغ روشن ہو سکتے ہیں اور اس کے نور میں کچھ کمی نہیں آتی اور شمس و قمر سے دوسروں کو صرف روشنی پہونچتی ہے یہ نہیں ہوتا کہ دوسری شئے نورانی بن کر کسی اور کو بھی منور کر سکے۔ اگر کہا جائے کہ آئینہ آفتاب یا چاند کے

[1] شمس آفتاب، قمر چاند، [2] روشنی والا۔

سامنے کیا جائے تو وہ خود بھی نورانی ہوجاتا ہے اور دیوار کو بھی منور کر دیتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ محض واسطہ فی العروض ہوتا ہے۔ واسطہ فی الثبوت نہیں ہوتا۔ اور چراغ واسطہ فی الثبوت ہوجاتا ہے جیسا کہ نور حق واسطہ فی الثبوت ہوتا ہے مگر یہ تشبیہ من کل وجہ نہیں کہ اس سے نعوذ باللہ دوسرا خدا تصنیف کرنے لگے۔ مطلب صرف یہ کہ نور حق دوسروں کو بھی منور کرتا ہے اور منور بھی ہے گو دوسروں کی تنویر اس درجہ کی نہ ہو۔ اور یہ بات چراغ ہی میں ہے شمس وقمر میں نہیں ہے اور یہ سب نکات ہیں مقاصد نہیں ہیں۔ ہر شیئ کو اپنی حد پر رکھنا چاہیئے۔

(۸۳) واصل بحق ہونے پر شبہ

اس پر شاید کسی کو شبہ ہو کہ بارگاہ حق کی تو کہیں انتہا نہیں۔ جیسا کہ مولانا فرماتے ہیں۔ ؎

اے برادر بے نہایت درگہیست هرچه بروئے میرسی بروے مانیست

ایک اور عارف کہتے ہیں ؎

نگردد قطع ہرگز جادۂ عشق از دویدنہا۔
کہ می بالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا۔

اور جب اس کی انتہا کہیں نہیں۔ پھر وصول کے کیا معنی کیونکہ وصول تو محدود ہوسکتا ہے غیر محدود تک کہاں ہوسکتا ہے۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ وصول کے دو معنیٰ ہیں ایک وصول محدود ہے ایک غیر محدود ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ تعلق مع اللہ کے دو درجے ہیں ایک سیر الی اللہ یہ تو محدود ہے ایک سیر فی اللہ یہ غیر محدود ہے۔ سیر الی اللہ یہ ہے کہ نفس کا علاج شروع کیا یہاں تک کہ امراض سے شفا ہوگئی اور ذکر وشغل سے قلب کی تعمیر شروع کی یہاں تک کہ وہ انوار ذکر سے معمور ہوگیا یعنی تخلیہ[1] وتحلیہ کے قواعد جان گئے۔ موانع مرتفعہ کر دیئے۔ معالجۂ امراض سے

[1] تخلیہ خالی کرنا تحلیہ آراستہ کرنا

واقف ہوگئے نفس کی اصلاح ہوگئی اخلاق رذیلہ زائل ہوگئے۔ اور اخلاق حمیدہ سے انوار ذکر سے قلب آراستہ ہوگیا۔ اعمال صالحہ کی رغبت طبیعت ثانیہ بن گئی۔ اعمال وعبادات میں سہولت ہوگئی۔ نسبت اور تعلق مع اللہ حاصل ہوگیا۔ تو سیر الی اللہ ختم ہوگئی۔ اس کے بعد سیر فی اللہ شروع ہوتی ہے کہ خدا تعالیٰ کی ذات وصفات کا حسب استعداد انکشاف ہونے لگا۔ تعلق سابق میں ترقی ہوئی۔ اسرار وحالات کا ورود ہونے لگا یہ غیر محدود ہے یہی وہ تعلق ہے جس کی نسبت کہا گیا ہے ؎

بحریست بحر عشق کہ ہیچش کنارہ نیست
آنجا جز اینکہ جاں بسپارند چارہ نیست

اور اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص سائنس کا امتحان دیتا ہے یہانتک کہ پاس ہوگیا اور سند مل گئی تو اس وقت سیر الی سائنس ختم ہوئی اس کے بعد سیر فی سائنس ہے کہ تحقیقات میں اضافہ ہونئی نئی باتیں منکشف ہوں اس کی کوئی حد نہیں چنانچہ اہل سائنس خود اس پر متفق ہیں کہ تحقیقات سائنس کا سلسلہ غیر محدود ہے۔

جب ایک دنیوی تعلق کا یہ حال ہے تو تعلق مع اللہ کا کیا حال ہوگا۔ دوسری مثال اور لیجئے کہ ایک کرہ جو اپنے مرکز سے الگ ہوگیا ہو اور وہ حرکت اینیہ کرکے مرکز پر پہنچ جائے تو اس وقت حرکت الی المرکز ختم ہوئی۔ پھر اس کے بعد اپنے مرکز پر پہونچ کر وہ حرکت وضعیہ کرتا ہے اس کی کوئی حد نہیں۔ اسی طرح یہاں سمجھو۔ پس وہ شبہ جاتا رہا کہ جب بارگاہ حق غیر متناہی اور غیر محدود ہے تو وصول کے کیا معنی۔ سو میں نے بتلا دیا کہ تعلق مع اللہ ایک معنی کے اعتبار سے محدود ہے۔ یعنی سیر الی اللہ کے اعتبار سے اور اکثر اسی حد پر خلافت دے دی جاتی ہے اور سالک[1] کو مجاز بنایا جاتا ہے۔ جیسے علوم ظاہر میں ایک نصاب خاص کے ختم کرنے پر اور پاس کرلینے پر سند دی جاتی ہے یہ محدود ہے پھر آگے عمر بھر علوم میں ترقی ہوتی رہتی ہے یہ غیر محدود ہے ایک درجہ غیر محدود ہے۔ اسی طرح یہاں تعلق کا محدود ہونا بھی صحیح ہے اور غیر محدود ہونا بھی صحیح ہے۔

(غایۃ النجاح ص ۳۸)

[1] راہ خدا طے کرنیوالا۔

(۸۴) بعض لوگوں کا بغیر عمل کامل ہوجانے کی تمنا کرنا غلط ہے

لوگ خاص دین کے باب میں اس کے درپے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہم کو ایسا شدید تعلق ہوجائے کہ حقوق خود بخود ادا ہوتے رہیں۔ ہم کو کچھ کرنا نہ پڑے بس محبت و شوق کا ایسا غلبہ ہوجائے کہ نماز روزہ خود ہی ادا ہوتا رہے۔ سو یہ حالت غیر اختیاری ہے بندہ کے اختیار میں نہیں۔ بلکہ اس کے ذمہ یہ واجب ہے کہ اپنے ارادہ اختیار سے کام لے اور غیر اختیاری امور کے درپے نہ ہو۔ یہ بہت ضروری مسئلہ ہے جیسے حدیث میں الطھور[1] شطر الایمان، وارد ہے اسی طرح میں اس مسئلہ کو نصف السلوک سمجھتا ہوں کہ اختیاری میں کوتاہی نہ کرے اور غیر اختیاری امور کے درپے نہ ہو۔ لوگوں نے آجکل صرف نماز روزہ کا نام دین رکھ لیا ہے۔ حالانکہ یہ عمل دین کا جزو ہے کہ اختیاری امور کے درپے ہو غیر اختیاری کے درپے نہ ہو۔ یاد رکھو کہ یہ امور غیر اختیاریہ یعنی حالات وکیفیات وغیرہ اگر کبھی حاصل ہوتے ہیں اعمال اختیاریہ ہی میں مشغول ہونے سے حاصل ہوتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ عمل اختیاری سے غیر اختیاری کی نیت بھی نہ کرے کیونکہ حصول میں تعجیل[2] و تاجیل اختیار سے باہر ہے کبھی تو نقصان عمل کی وجہ سے تاجیل ہوتی ہے کبھی قلت استعداد و ضعف استعداد کی وجہ سے دیر ہوتی ہے پس تم اس کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کردو۔ خود ان کے درپے نہ ہو۔ بلکہ ان اعمال کے درپے ہو جو تمہارے اختیار میں ہیں ؎

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن۔
کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند۔

وہ خود جانتے ہیں کہ تمہارے لئے کیا مناسب ہے کیا نہیں اس لئے اگر حالات و

---

[1] پاک وصاف رہنا آدھا ایمان ہے۔ [2] تعجیل جلدی کرنا تاجیل دیر کرنا

کیفیات تمہارے لئے مناسب ہوں گے عطا کردیں گے نہیں مناسب ہوں گے تو نہیں عطا کریں گے۔ دیکھو ماں اپنے بچے کے واسطے جو مصلحت سمجھتی ہے وہی کرتی ہے بچہ کی خواہش پر عمل نہیں کرتی۔ خصوصاً باپ کہ وہ تو بچہ کی ضد سے مغلوب ہی نہیں ہوتا۔ ماں تو کسی وقت مغلوب بھی ہوجاتی ہے۔ مگر زیادہ حالت یہی ہے کہ والدین بچہ کے ساتھ اپنی رائے کے موافق معاملہ کرتے ہیں جو مصلحت جانتے ہیں ویسا ہی عمل کرتے ہیں گو بچہ کتنا ہی ضد کرے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

طفل می لرزد زنیش احتجام مادر مشفق ازاں غم شاد کام

بچہ پچھنے لگانے والے کے نشتر وغیرہ کو دیکھ کر روتا ہے ڈرتا ہے مگر ماں خوشی کے ساتھ اس کے پچھنے لگواتی ہے کیونکہ اس کی نظر انجام صحت پر ہے تو جب باپ ماں بچوں کی رائے پر کام نہیں کرتے پھر حق تعالیٰ بندوں کی رائے پر کیوں کام کریں۔ اور تم سے مشورہ کیوں لیں۔ وہاں شخصیت ہے پارلیمنٹ نہیں ہے غرض اعمال اختیاریہ میں بھی امور غیر اختیاریہ کا قصد نہ کرے۔ جو بات اس کے اختیار میں نہیں اس کی طرف التفات ہی نہ کرے۔ بلکہ اپنے کام میں لگے۔ (رفع الالتباس عن نفع اللباس ص۵)

(۸۵) بزرگوں کے طریقۂ اصلاح پر شبہ کا جواب

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس طریقہ سے یعنی طرق اصلاح اختیار کرنے سے معتقد کم ہوجائینگے میں کہتا ہوں اول تو یہ خیال غلط ہے گو ظاہر میں تمہارے پاس آدمی کم آئیں۔ مگر دل میں معتقد زیادہ ہوں گے۔ اور مان لو معتقد کم ہوئے تو کیا فوج بھرتی کرکے کہیں لام پر بھیجوگے اگر زیادہ معتقد بھی ہوئے اور کام نہ کئے تو ان کو لے کر کیا کروگے۔ اس سے تو یہ اچھا ہے کہ معتقد تھوڑے ہوں اور کام کے ہوں اس میں تو زیادہ راحت ہے کہ ہجوم خلق زیادہ نہ ہوگا۔ کیونکہ ہجوم سے اوقات میں خلل پڑتا ہے۔

یہ جواب تو بطور ارخاء[1] عنان کے ہے ورنہ میرا اصلی مذاق یہ ہے کہ مجھے تو لوگوں کے

---

[1] ڈھیل دینا

اعتقادی سے وحشت ہوتی ہے۔ مگر جسے ہجوم خلائق سے محبت ہو جو ہر وقت اپنے گرد مجمع چاہتا ہو وہ تو بیشک معتقدین کی قلت سے گھبرائے گا اور وہ طریق اصلاح کو اختیار نہ کریگا۔ اسی واسطے میں بیعت میں جلدی نہیں کرتا بلکہ بہت سے شرائط کے بعد کرتا ہوں۔ اس میں ہمارے بعض احباب کی رائے یہ ہے کہ اتنی سختی نہ کرنی چاہیئے بلکہ جہاں تک ہو سکے لوگوں کو اپنے سے وابستہ کرنا چاہیئے۔ میں کہتا ہوں کہ وابستہ کرکے اصلاح کرو تب تو فائدہ بھی ہے ورنہ وہ تو وابستہ ہو کر طریق سے بیکار اور پابستہ[1] ہو جائے گا۔ کیونکہ جلدی بیعت کر لینے سے وہ سمجھے گا کہ اس طریق میں عمل کے اہتمام کی ضرورت نہیں۔ اب بتلاؤ وہ طریق سے پابستہ ہوگا یا نہیں۔ اور جب اس سے شرطیں کی جائیں گی تو عمل کی ضرورت ابتدار ہی سے اس کے ذہن نشین ہو جائے گی۔ پھر وہ عمل کا اہتمام کرے گا اور بار بار روک ٹوک کرنے سے اس میں ترقی ہوگی۔ اگر وہ روک ٹوک کا تحمل کرتا رہا۔ تو انشاء اللہ بہت جلد اصلاح پذیر ہو جائے گا۔ اور بدون اس کے تو فضول بھرتی کرنا ہے۔ غرض اخلاق باطنہ کی حقیقت یہ ہے کہ اعمال باطنہ درست ہوں۔ (الجمعین بین النفعین ص۲۷)

(۸۶) طاعون سے بھاگنا تدبیر کے خلاف ہے

میں کہتا ہوں کہ بھاگنا دراصل تدبیر ہی نہیں۔ بلکہ سوءِ تدبیر ہے کیونکہ بھاگنا جیسا ضعف قلب سے ناشی ہے اسی طرح وہ ضعف کا منشا بھی ہے۔ یعنی بھاگنے والا اس فعل سے ضعف کو اپنے قلب پر غالب کر لیتا ہے۔ طبی قاعدے سے ایسے امراض ضعیف القلب پر سب سے پہلے قبضہ کر لیتے ہیں۔ تو بھاگنے والے نے تو اسی وقت اپنے اوپر طاعون کو قبضہ دیدیا۔ اگر وہ یہاں نہیں مرا تو دوسری جگہ جا کر مرے گا۔ اب بتلایئے بھاگنا تدبیر کس طرح ہے۔

دوسرے، میں کہتا ہوں، اگر بھاگنا مفید بھی ہو۔ اور بھاگنے والا طاعون سے بچتا بھی ہو تو تب بھی شریعت کو حق ہے کہ اس مفید فعل سے منع کر دے کیونکہ بعض مفید

[1] پاؤں بندھا ہوا

افعال سے آپ بھی تو منع کرتے ہیں۔ مثلاً لڑائی[1] میں سے بھاگنا تمام عقلاء کے نزدیک جرم ہے حالانکہ یقیناً بھاگنے والے کو تو بھاگنا ہی مفید ہے۔ اس کی جان بچتی ہے مگر اس کو آپ کے لیڈر بھی تدبیر نہیں کہتے۔ بلکہ بے تدبیری کہتے ہیں۔ اسی طرح ہم طاعون سے بھاگنے کو بے تدبیری کہتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے نزدیک دلیل شرعی سے طاعون سے بھاگنا ایسا ہی ہے جیسا جنگ سے بھاگنا اور جہاد سے بھاگنا۔ کیونکہ طاعون کی نسبت حدیث میں وارد ہے۔ والفار[2] منہ کالفار من الزحف اور ایک حدیث میں طاعون کی حقیقت میں وخز اعدائکم الجن[3] وارد ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ اس وقت جنات کا اور انسانوں کا مقابلہ ہوتا ہے۔ جنات انسانوں کے اندرون جسم میں زخم لگاتے ہیں۔ جس سے طاعون ہوتا ہے۔ اور مقابلہ سے بھاگنا عقلاً بھی بے تدبیری ہے اس لئے شریعت نے فرار کو حرام کر دیا۔ تو اس حقیقت میں اطباء اور ڈاکٹروں کا اختلاف ہے۔ ڈاکٹر جراثیم کو سبب بتلاتے ہیں۔ مگر اس سے مضمون حدیث کی نفی نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ ممکن ہے کہ یہ سبب بھی ہو اور وہ بھی۔ مگر اصل سبب وخز جن ہو اور ظاہری سبب وہ ہو جو تم کہتے۔ پھر ایک اور بات بھی ہے کہ یہاں سے بھاگ کر جو لوگ دوسری جگہ جاتے ہیں۔ وہ وہاں کے آدمیوں کی نگاہ میں ذلیل ہوتے ہیں۔ اور خصوصاً اگر تم طاعون کی جگہ سے بھاگ کر کسی شہر میں اپنے کسی دوست یا عزیز کے گھر میں ٹھہرے ہو۔ اور اتفاقاً تمہارے جانے کے بعد اس کے گھر کوئی بیمار پڑ گیا تو اس وقت اس کی نگاہ میں تمہاری بہت ذلت ہوگی جس کو قرائن سے تم خود بھی سمجھ جاؤ گے کیونکہ وہ یہ سمجھے گا کہ میرے گھر میں تو بیماری نہ تھی ـــ یہ کمبخت میرے گھر بیماری لے آیا اور اگر وہ بیمار مر گیا تو اسکی موت گھر والوں کے خیال میں تمہارے نامۂ اعمال میں درج ہوگی، سچ ہے ؎

عزیزے کہ از درگہش سر بتافت ـــ بہر در کہ شد ہیچ عزت نیافت

پھر اس طرح یہ لوگ دوسری جگہ بھی طاعون پھیلاتے ہیں نہ بطریق عدوی کے بلکہ اسی قاعدہ سے کہ یہ وہاں جا کر لوگوں کے قلوب میں وہم پھیلاتے ہیں۔ تو دوسری بستی کے لوگ ان بھاگنے والوں سے یوں کہتے ہیں کہ خدا خیر کرے۔ کہیں ہماری بستی میں بھی

[1] لڑائی۔ [2] اس سے بھاگنے والا میدان کارزار سے بھاگنے والے کی طرح ہے۔ [3] جن کا زخم لگانا

طاعون نہ ہو جائے۔ جس سے ان میں بھی قبول طاعون کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کیسی رحمت ہے کہ آپ نے بھاگنے سے، منع فرما دیا۔

(الجمعین بین النفعین ص۴۳)

(۸۷) منافقین کے نماز جنازہ میں حضرت عمرؓ کی رائے کے افضل ہونیکا شبہ اور اسکا جواب!

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی رائے تھی۔ وہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا فیض تھا کیونکہ کفار و منافقین پر غیظ[1] اور ان سے نفرت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ہی کی برکت سے نصیب ہوئی۔ ورنہ آپ کی صحبت سے پہلے تو وہ خود ہی خالی تھے اور قتل رسول کا منصوبہ باندھ کر آئے تھے۔ حضورؐ پر ایمان لانے کے بعد حق تعالیٰ نے ان کو کفار و منافقین سے نفرت اور غیظ عطا فرمایا۔ مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ صرف عمر ہی تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم رسول بھی تھے اور عمر بھی تھے۔ بلکہ یوں کہو کہ آپ آدم علیہ السلام بھی تھے۔ نوح علیہ السلام بھی تھے۔ ابراہیم علیہ السلام بھی تھے۔ موسیٰ علیہ السلام بھی تھے۔ عیسیٰ علیہ السلام بھی تھے۔

حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا داری — آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

حضورؐ کی شان

حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں تمام شانیں جمع تھیں غیظ و غضب علی الکفار بھی آپؐ کے اندر تھا اور رحمت و رأفت بھی اعلیٰ درجہ کی آپ میں تھی مگر آپ میں غلبہ رحمت ہی کو تھا۔ اس لئے جب کوئی بہانہ بھی رحمت کا ملتا تھا آپ رحمت ہی کا برتاؤ کرتے تھے جب رحمت کا کوئی بہانہ نہ ہوتا اس وقت غضب فرماتے تھے۔ عبداللہ بن ابی گو منافق تھا مگر کھلم کھلا کافر نہ تھا۔ اور منافقوں کے احکام کفار معلنین کے احکام سے جدا تھے ان کے ساتھ احکام حیات میں وہی برتاؤ

[1] غصہ

ہوتا تھا جو مسلمانوں کے ساتھ کیا جاتا تھا اور موت کے احکام ہنوز نازل نہیں ہوئے تھے۔ اس لئے بوجہ غلبت رحمت کے آپ نے احکام حیات پر قیاس کر کے اس کے ساتھ اموات مسلمین جیسا برتاؤ کیا۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بوجہ غلبہ غیظ و شدت کے احکام حیات کو ضرورت و مصلحت پر مبنی سمجھ کر احکام ممات میں منافقین کو کفار معلنین پر قیاس کیا اور یہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا فیض تھا اور یہ قیاس بھی آپ سے مخفی نہ تھا۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غلبۂ رحمت کی وجہ سے پہلے قیاس کو ترجیح دی کیونکہ جب تک آپ کو موقع ملتا تھا۔ آپ رحمت ہی کے پہلو کو اختیار فرماتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شان ہم مسلمانوں کے لئے بہت کچھ موجب تسلی ہے کیونکہ ؎

دوستاں را کجا کنی محروم — تو کہ با دشمناں نظر داری۔

اور ؎

چہ غم دیوار امت را کہ باشد چوں تو پشتیبان
چہ باک از موج بحران را کہ دارد نوح کشتی بان

اب میں اس مقام پر ایک سوال علماء سے ظاہر کرتا ہوں وہ یہ کہ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ[1] سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تخییر کس طرح سمجھی۔ یہ تردید تو تسویہ کے لئے ہے کہ ان کے واسطے استغفار کرنا اور نہ کرنا برابر ہے ان کو دعاء سے استغفار سے کوئی نفع نہ ہوگا۔ چنانچہ اہل عربیت پر یہ بات مخفی نہیں۔ اسی طرح اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً[2] میں عدد کا ذکر تحدید کے لئے تھوڑا ہی ہے۔ اگر ستر دفعہ استغفار کروگے تو مغفرت نہ ہوگی۔ اس سے زیادہ کروگے تو ہو جائے گی۔ بلکہ یہاں عدد کا ذکر ایسا ہے جیسا محاورہ میں کہا جاتا ہے کہ سو دفعہ بھی کہے گا جب بھی نہ مانوں گا۔ ہزار دفعہ کہے گا جب بھی کچھ نہ ہوگا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ہزار دفعہ سے زیادہ کہا جائے تو مان لیں گے بلکہ یہ مطلب ہوتا ہے کہ یہ بات ہرگز نہ مانی جائے گی اور عدد کا ذکر صرف بیان کثرت کے لئے ہوتا ہے نہ تحدید کے لئے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خیرت فاخترت وسازید علی

[1] تم ان کے لئے مغفرت چاہو یا نہ چاہو۔
[2] اگرچہ آپ ان کے لئے ستر مرتبہ مغفرت چاہیں۔

السجین کیسے فرمایا۔ علماء ظاہر اس کا شافی جواب نہیں دے سکتے۔ اور جو لوگ محض ترجمۂ
قرآن پڑھ کر اجتہاد کے مدعی ہیں وہ تو کیا ہی جواب دیں گے۔ لیجئے اب میں علماء باطن کا
جواب عرض کرتا ہوں۔ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ
حالت رحمت کے غلبہ کی وجہ سے اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معانی کی طرف التفات
نہیں فرمایا بلکہ محض نفس الفاظ سے تمسک فرمانے لگے اور نفس الفاظ میں تخییر وحصر کی
گنجائش ضرور ہے گو محاورہ کے اعتبار سے گنجائش نہ ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ غلبۂ
حال کاملین پر کبھی ہو جاتا ہے۔ (المرابط ص۳۹)

(۸۸) تکمیل نماز کا طریقہ

تکمیل نماز کے لئے مراقبۂ موت و مراقبۂ لقاء اللہ کا عادی ہونا چاہیئے اور میرا ذوق
یہ کہتا ہے کہ آیت میں یہ مراد ہے کہ عین نماز کے اندر بھی اس مراقبہ میں قلب کو مشغول کیا جائے
جس کی صورت یہ ہے کہ نماز کی ہیئت میں غور کرے کہ میں جو تمام دنیا سے رُخ پھیر کر ہاتھ باندھ
کر اس طرح کھڑا ہوں کہ نہ کسی سے بات کر سکتا ہوں نہ کسی کی طرف دیکھ سکتا ہوں نہ کھا
پی سکتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہوں اور ان سے عرض
معروض کر رہا ہوں۔ پھر قیام کی حالت میں سوچے کہ خدا تعالیٰ کے مجھ پر کس قدر احسانات
وانعامات ہیں جن کا شکریہ میرے ذمہ واجب ہے اور سورہ فاتحہ پڑھتے ہوئے یہ سوچے
کہ میں اللہ تعالیٰ کے انعامات کا شکریہ ادا کر رہا ہوں اور اس کی ربوبیت کا اقرار اور
اپنی عبدیت کا اعتراف کر رہا ہوں اور اسی ... عبدیت پر قائم رہنے اور
اہلِ عبدیت کے طریقہ پر چلنے کی دعا کر رہا ہوں اور جو لوگ طریقہ عبدیت سے بہک گئے
اور لعنت وغضب کے مستحق ہو گئے ہیں ان کے طریقہ سے بیزاری کا اظہار کر رہا ہوں
اور جو قانون الٰہی تکمیل طریق عبدیت کے لئے نازل ہوا ہے اس پر ہمیشہ کے لئے چلنے
کا عہد کر رہا ہوں فاتحہ کے بعد سورت پڑھنے کا یہی مطلب ہے۔

سجدہ و رکوع میں سوچ

پھر جب رکوع میں جائے تو یہ سوچے کہ میری پیدائش
اسی مٹی اور زمین سے ہے جو میرے پاؤں تلے ہے

زمین کی خاک سے جیتا جاگتا۔ سمیع و بصیر انسان پیدا ہو جانا محض خالق جل وعلیٰ کی قدرت
ہے اور جس کی پیدائش زمین کی خاک اور اس کی نباتات وغیرہ سے ہو اس کو عبدیت
اور بندگی کے سوا کچھ زیبا نہیں، بڑائی اور بزرگی صرف خالق جل وعلا کو زیبا ہے جو تمام
عیوب سے بری ہے۔ اسی لئے نماز میں بار بار اللہ اکبر کہا جاتا ہے کہ اے خدا ہم نے آپ کی
عظمت کے سامنے اپنی خیالی عزت کو قربان کر دیا۔ پھر سجدہ میں جاتے ہوئے یہ
سوچے کہ مجھے ایک دن زمین کے اندر پیوند ہونا ہے اور اس وقت خدا کے سوا میرا ساتھ
دینے والا کوئی نہ ہوگا۔ دنیا سے میرا نام بھی مٹ جائے گا۔ اور نشان بھی، اس کے بعد
دوسرے سجدے میں یہ تصور کرے کہ گویا میں مر چکا اور خدا سے مل گیا ہوں اب خدا
کے سوا میرے ساتھ کوئی نہیں۔

جلسۂ تشہد میں سوچ

پھر جلسۂ تشہد میں یہ سوچے کہ مرنے کے بعد پھر ایک زندگی
ہو گی جہاں اسلام اور اعمال واقوال واحوال
صالحہ ہی کام آئیں گے جو اللہ تعالیٰ کے واسطے کئے
گئے ہوں اور سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور جملہ انبیاء وحضرات ملائکہ اور تمام نیک
بندوں کی عزت ظاہر ہو گی۔ اور وہ گنہگاروں کی شفاعت کریں گے لہٰذا ان پر سلام
بھیج کر ان سے تعلق پیدا کرنا چاہیئے پھر چونکہ امت محمدیہ کو سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم کے ساتھ سب سے زیادہ تعلق ہے اس لئے اخیر رکعت میں آپ پر خصوصیت کے
ساتھ درود پڑھنا چاہیئے۔ جب یہ تصور جم جائے تو اس کے بعد جلسہ میں یوں تصور کرے
کہ گویا مرنے کے بعد یہ میدانِ قیامت میں حاضر ہوا ہے۔ اور تمام اعمال وافعال و اقوال
جو دنیا میں کئے ہیں اس کے سامنے ہیں جن میں سے وہی کام آرہے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے
واسطے کئے گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام انبیاء وصلحاء وملائکہ کی جماعت
سامنے ہے جو دربار الٰہی میں حاضر ہیں۔ اور میں ان سب پر درود شریف وسلام
بھیج رہا ہوں۔

اخیر نماز میں تصوّر

اور آخر میں اپنے لئے کامیابی ونجات وفلاح کی دعا کر رہا ہوں
اور اسی واسطے آیت میں لفظ یظنون اختیار کیا گیا ہے
حالانکہ لقاء اللہ کا تو اعتقاد جازم فرض ہے محض ظن کافی نہیں

مگر چونکہ مقصود یہ ہے کہ نماز میں لقاء اللہ و رجوع الی اللہ کا استحضار کیا جائے اور یہ استحضار درجۂ وقوع میں لازم نہیں بلکہ اس کا ظن اور تصور بھی نماز میں کافی ہے کہ گویا میں اس وقت خدا کے سامنے حاضر ہوں اور مر گیا ہوں یا مرنے والا ہوں اور گویا میں اس وقت عالم آخرت میں حاضر ہوں اسی واسطے لفظ ظن اختیار کیا گیا۔ اس طرح نماز پڑھنے سے خشوع حاصل ہو جائے گا اور تمام خیالات و وساوس قلب سے نکل جائیں گے۔ واللہ تعالیٰ اعلم!

ھذا کلھا من سیدی ومرشدی حضرت مولانا ظفر احمد صاحب دام ینوضھم۔ (النجم صـ۱۸)

(۸۹) چندہ وصول کرنے کے مفاسد۔

لوگوں کو سکریٹری وغیرہ صرف اس لئے بنایا جاتا ہے کہ وہ چندہ خوب وصول کرتے ہیں۔ غرباء کے اوپر ٹیکس کی طرح چندہ مقرر کرتے ہیں اور اپنے دباؤ اور اثر سے جبراً وصول کرتے ہیں اس کام میں ان کی مدح کی جاتی ہے کہ فلاں صاحب دین کے کاموں میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں سبحان اللہ یہ بڑا دین کا کام کیا کہ غرباء کے گلے پر چھری رکھ کر چندہ وصول کر لیا۔ ان سے اچھے تو وہ لوگ ہیں جو کھلم کھلا ڈاکو ہیں۔ کیونکہ وہ لوگوں سے مال چھین کر اپنے بال بچوں کو تو کھلاتے ہیں جن کا نان و نفقہ ان کے ذمہ واجب ہے تو گو ان کا یہ ذریعۂ معاش تو حرام ہے مگر صرف ایسا ہے جسمیں خرچ کرنا ان کے ذمہ واجب تھا۔ تو وہ حرام کا ارتکاب کر کے ایک واجب سے تو سبکدوش ہوئے اور یہ سکریٹری صاحب حرام طریقہ سے چندہ وصول کر کے ایسی جگہ صرف کرتے ہیں جس کی خدمت ان کے ذمہ واجب بھی نہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ انجمن کی خدمت ان کے ذمہ واجب نہیں اور ڈاکو کی سزا معلوم ہے تو لوگ اس کے واسطے تیار رہیں۔ افسوس آج کل چندہ میں اس کا اصلاً لحاظ نہیں کیا جاتا۔ یہ مال خوشی سے دیا گیا ہے یا جبر سے۔

بیوی کے مال میں طیب نفس کی قید

حق تعالیٰ شانہ نے بیوی کے مال کے بارہ میں بھی فرمایا۔ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا کہ اگر بیوی اپنے دل کی خوشی سے اپنے

مہر میں سے مرد کو کچھ دیدے تو اس کا کھانا جائز ہے یہاں بھی طیب نفس کی قید ہے حالانکہ میاں بیوی کا تعلق عاشقی معشوقی کا تعلق ہوتا ہے۔ اور ایسے تعلق میں ناگواری بھی بہت ہی کم ہوتی ہے تو پھر غرباء کا روپیہ بدون طیب قلب کے کیونکر جائز ہوگا۔ بیوی کے معاملہ میں ایک مقام پر اس سے بڑھ کر ارشاد فرمایا ہے وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى۔ کہ اگر تم نے اپنی بیوی کو دخول سے پہلے طلاق دے دی ہو اور مہر مقرر ہو چکا ہو تو بیوی کے لئے نصف مہر ہے مگر یہ کہ وہ اپنا حق معاف کر دے (تو کچھ نہ رہے گا) یا جس کے ہاتھ میں نکاح کی ڈور ہے (یعنی شوہر) وہ معاف کر دے (تو پورا مہر رہے گا) اور اے مردو تم معاف کر دو تو یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے یعنی مرد کے لئے زیادہ بہتر ہے کہ عورت کی معافی کا منتظر نہ رہے بلکہ خود اپنا حق معاف کر دے۔ تو دیکھئے کہ باوجودیکہ عورت اگر خوشی سے مہر معاف کر دے تو اس کا قبول کرنا جائز ہے اور اس کی اجازت دیدی گئی تھی مگر اس مقام پر دوسرا ادب سکھلا دیا گیا ہے کہ غیرت کا مقتضیٰ یہی ہے کہ عورت کی معافی قبول نہ کرو بلکہ تم اس کے ساتھ احسان کرو۔

چندہ و ہدیہ کے آداب

جب بیوی کے ساتھ لین دین کرنے اور اس کا عطیہ قبول کرنے کے لئے یہ آداب ہیں تو بھلا چندہ کے لئے آداب نہ ہوں گے۔ ضرور ہیں اور ان کا لحاظ کرنا واجب ہے۔ شریعت مقدسہ نے تو ہدیہ کے لئے بھی آداب مقرر کئے ہیں چنانچہ ایک ادب یہ ہے ما اتاك من غیر اشراف نفس فخذہ، ومالا فلا تتبعہ نفسك۔ کہ جو چیز ہدیہ وغیرہ بدون انتظار کے آجائے لے لو۔ اور جو انتظار سے آئے اپنے نفس کو اس کے پیچھے مت ڈالو۔ (اصل العبادہ صـ۶)

مگر چندہ میں تو قصداً یہ تدبیر کی جاتی ہے کہ مجمع میں تحریک کی جائے۔ تاکہ جو شخص ایک روپیہ دیتا وہ شرما شرمی (پانچ) روپے تو دے گا۔ یاد رکھو یہ صورت بالکل ناجائز ہے مگر لوگ سمجھتے ہیں کہ اس کے بغیر کام نہیں چلتا۔ میں کہتا ہوں یہ تبلاؤ مقصود بالذات کیا ہے کام مقصود ہے یا دین؟ اگر صرف کام ہی مقصود ہے تو منافقین درک اسفل میں کیوں ہوں گے۔ کیونکہ وہ بھی تو جہاد و صدقہ وغیرہ کرتے تھے معلوم ہوا کہ جس کام

میں رضائے حق نہ ہو وہ کام ہی نہیں بسلمان کا اصل مقصود رضائے حق ہے چاہے کام تھوڑا ہو مگر رضائے حق کے موافق ہونا چاہیئے۔ مثلاً اگر یتیم خانہ بہت بڑا ہو مگر رضائے حق نہ ہو تو اس کو لے کر کیا کرنا ہے۔

ایک انجمن کا واقعہ

چنانچہ آجکل جو ایک بہت بڑی انجمن ہے میں اس کا نام بیان کرنا نہیں چاہتا۔ اس کا ایک واقعہ عجیب سنا ہے جس سے حیرت ہوگئی وہ یہ کہ لکھنؤ میں کسی نے بہت جائے داد ایک متوکل عالم تنگدست کے سامنے پیش کی کہ اس کو قبول فرما کر اپنے تصرف میں لائیے انہوں انکار کر دیا۔ اس کے بعد اس نے انجمن والوں کے سامنے پیش کیا کہ میری طرف سے اس کو انجمن کے واسطے وقف کر دو انہوں نے قبول کر لیا۔ لکھنؤ کے عوام نے اس پر عجیب فقرہ کسا کہ میاں وہ بزرگ تو اکیلے تھے ان کو گناہوں کے انبار کا تحمل نہ تھا اور انجمن میں تو بہت موٹے موٹے ہیں وہ سب مل کر تھوڑا تھوڑا اٹھالیں گے اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ ان لوگوں کو صرف انجمن کا چلانا مقصود ہے رضائے حق مقصود نہیں ورنہ حلال وحرام کی ضرور رعایت کرتے۔

حبِّ جاہ

اور یہ ساری خرابی حبّ جاہ کی ہے کہ ان لوگوں کو کام سے مقصود جاہ مطلوب ہے۔ چنانچہ ڈیگ میں ایک انجمن کے سکریٹری مجھ سے ملے اور انجمن سے لوگوں کی بے توجہی کی شکایت کرنے لگے میں نے کہا کہ دوسروں کو کام میں لگانے کی اور ان کی شکایت کی آپ کو کیا ضرورت ہے آپ پہلے خود کام کرنا شروع کر دیں جتنا بھی آپ سے ہو سکے۔ دوسروں کو آپ تنگ نہ کریں پھر کام میں خود کشش ہوتی ہے لوگوں کو خود بخود توجہ ہو جائے گی۔ جب وہ چلے گئے تو لوگوں نے مجھ سے کہا کہ تم نے ان کے مرض کو خوب سمجھا۔ واقعی بات یہی ہے کہ یہ خود تو کچھ کام نہیں کرتے اور دوسروں سے چندہ وصول کرنا اور کام لینا جانتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے سیکریٹری بننے کا شوق ہے اور کام کے نام صفر ہے۔ غرض واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ آجکل جو لوگ دین کی خدمت کرتے محض جاہ کے لئے کرتے ہیں دین اور رضائے حق مطلوب نہیں۔

(ایضاً ص۹)

(۹۰) حق تعالیٰ بدون ابتلاء و امتحان کے جنت کیوں عطا نہیں فرماتے

اس کا جواب یہ ہے کہ بیشک حق تعالیٰ اس پر قادر ہیں کہ بدون ابتلاء و امتحان کے سب کچھ عطا فرما دیتے مگر وہ ایسا نہیں کرتے بلکہ انسان کو ابتلاء و تکلیف کے بعد ہی دولتِ قرب عطا فرما دیتے ہیں اور قرب ہی کا نام نجات ہے اور ہلاکت فراق و بُعد کا نام ہے۔ ؎

شنیده ام که سخن خوش که پیر کنعاں گفت　　فراق یار نہ آں می کند کہ بتواں گفت
حدیث ہول قیامت کہ گفت واعظ شہر　　کنا یتیست کہ از روزگار ہجراں گفت

چنانچہ ایک مقام پر ارشاد ہے۔ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ[۱]۔ رہا یہ کہ اس کی کیا وجہ ہے سو اس کے بارہ میں ہمارے بزرگوں کا مسلک یہ ہے کہ حکم کی تفصیل میں گفتگو نہیں فرماتے۔ ان کا طریقہ یہ ہے۔ ابہموا ما ابہمہ اللہ۔ کہ جس چیز کو خدا تعالیٰ نے مبہم رکھا ہے تم بھی اس کو مبہم ہی رکھو۔

امتحان و ابتلاء کی حکمت

پس اجمالا ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ ابتلاء میں حکمت ضرور ہے گو ہم کو معلوم نہ ہو اور اس باب میں ایک بات جو بے ساختہ دل میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر انسان سے طاعت بدون ابتلاء مقصود ہوتی تو اس کے لئے ملائکہ پہلے سے موجود تھے انسان کے پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی کیونکہ ملائکہ اطاعت بدون ابتلاء ہی کرتے ہیں ان میں منازعت کا مادہ ہی موجود نہیں اور انسان کے اندر مقاومت[۲] و منازعت احکام کا مادہ رکھا گیا ہے مگر وہ ایک خاص درجہ پر ہے اور وہ بھی تکمیل اجر کے لئے اس میں رکھا گیا ہے کیونکہ طاعت بلا منازعت سے طاعت بمنازعت افضل ہے بوجہ مجاہدہ کے

۱ لوگ کیا خیال کرتے ہیں کہ وہ اس کہنے پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ ہم ایمان لے آئے اور وہ امتحان میں مبتلا نہیں کئے جائیں گے؟
۲ مقابلہ سے لڑائی۔

وہ درجۂ خاص کی قید میں نے اس لئے لگائی کہ اگر منازعت خاص درجہ پر نہ ہوتی تو الدین یسرؐ کے خلاف ہوتا۔ اس لئے میں نے یہ قید لگادی اور یہ منازعت بھی ابتدا ہی میں ہوتی ہے بعد رسوخ کے یہ منازعت بھی باقی نہیں رہتی بلکہ احکام الٰہیہ امور طبعیہ بن جاتے ہیں حق تعالیٰ نے افعال حسیہ میں بھی یہی قاعدہ رکھا ہے چنانچہ مشی وغیرہ میں ابتدا ہی میں ارادہ کی ضرورت ہوتی ہے پھر ہر قدم پر ارادہ کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ وہی پہلا ارادہ مستمر قرار دیا جاتا ہے اور اسی وجہ سے اس کو فعل اختیاری کہا جاتا ہے اس پر یہ شبہ نہ ہو کہ شاید پھر ثواب کم ہوجاتا ہو گا کیونکہ طاعت بلا منازعت سے طاعت بمنازعت افضل ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ یہی ہے کہ ابتدا سے منازعت کا مقابلہ کرنے کے بعد ثواب منازعت ہی کا ہمیشہ ملتا ہے کیونکہ اس نے تو اپنی طرف سے مقاومت منازعت کے دوام کا قصد کر کے عمل شروع کیا ہے چنانچہ ہر مسلمان جو روزہ نماز کا پابند ہے اس کا ارادہ یہی ہے کہ ہمیشہ نماز پڑھوں گا۔ ہمیشہ روزہ رکھوں گا۔ خواہ نفس کو کتنا ہی گراں ہو اب یہ حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ وہ بعد میں منازعت کو باقی نہیں رکھتے مگر چونکہ بندہ نے ہمیشہ کے لئے اس منازعت کا مقابلہ کرنے کا ارادہ کرلیا ہے اس واسطے اس کو زوال منازعت کے بعد بھی بوجہ نیت دوام کے وہی ثواب ملتا ہے جو منازعت کے ساتھ ثواب ملتا ہے۔ تو جیسے مشی کو فعل اختیاری اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ابتدا میں اختیار و ارادہ کی ضرورت ہے گو بعد میں ضرورت نہیں رہتی اسی طرح یہاں بھی گو بعد میں منازعت نہیں رہتی مگر چونکہ ابتدا میں منازعت کی مخالفت کی ضرورت تھی اس لئے انتہا تک اس مخالفت منازعت کو حکماً مستمر قرار دیا جائے گا۔ اور یہاں سے پتہ لگتا ہے حق تعالیٰ کی رحمت کا۔

عبادت میں لذت کے باوجود ثواب

ورنہ عقل کا مقتضا یہ ہے کہ جب منازعت ختم ہوجاوے اور عبادت میں لذت وحظ پیدا ہوجائے تو اس شخص کو اجر نہ ملے۔ کیونکہ اب طاعت مع الابتلاء نہیں ہے اس وقت عقل کہتی ہے کہ یہ شخص اجر کا مستحق نہیں۔ مگر حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تجھے ہمارے بندہ

---

[1] دین آسان ہے [2] چلنا

سے محبت نہیں ہے ہم اس کو منازعت ہی کا اجر دیں گے گو اب محنت کچھ نہیں رہی مگر اب ہم اس کو پنشن دیں گے لیکن عقل پنشن کو جائز نہیں کرتی۔ جیسے معتزلہ نے کہا ہے کہ گناہوں پر سزا دینا ضروری ہے عفو و مغفرت خلاف عقل ہے پس یوں کہئے کہ رسوخ کے بعد بندہ کی وہ حالت ہوجاتی ہے جو بعضے پیروں کی وہ حالت سنی گئی ہے کہ جب کوئی مریدان کی دعوت کرتا ہے تو وہ دعوت کے بعد نذرانہ بھی لیتے ہیں۔ جس کو دانت گھسائی کہنا چاہیئے تو حق تعالیٰ نے یہ کر کے دکھلا دیا کہ وہ بندہ کو دانت گھسائی بھی دیتے ہیں کیونکہ انتہا میں طاعت کا بجا لانا کچھ کمال نہیں رہتا بلکہ اس کے ترک میں تکلف ہوتا ہے۔ اخیر میں وہ حالت ہوجاتی ہے جو حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں وارد ہے کان خلقہ القرآن کہ قرآن پر عمل کرنا آپ کی طبیعت تھی آپ کی تو فطرت ہی سے طبیعت تھی۔ مگر کاملین کی بھی اخیر میں اسی کے قریب حالت ہوجاتی ہے اور اس وقت اس کے حق میں وعیدات کی ایسی شان ہوجاتی ہے جیسے ماں بچہ کو بعض دفعہ دودھ پلانا چاہتی ہے اور وہ کھیل کے شوق میں بھاگتا ہے تو وہ اس کے چپت لگاتی ہے ایسے ہی منتہی کے لئے یہ وعیدات بغرض اظہار شفقت و رحمت ہیں بلکہ میں کہتا ہوں کہ مبتدی کے لئے بھی وعید محض اظہار شفقت و رحمت کے لئے ہے کیونکہ بات یہ ہے کہ انسان کو فطرۃً حق تعالیٰ سے محبت ہے اور مبتدی کو جو احکام میں منازعت ہوتی ہے یہ خلاف محبت نہیں بلکہ اس کا منشا یہ ہے کہ محبت کی وجہ سے اس کو حق تعالیٰ پر ناز ہے یہ یوں کہتا ہے کہ جب مجھے محبت ہے تو مجھے آرام دینا چاہیئے میرے اوپر یہ تکالیف اور قیود کیوں ہیں اور بزبان حال یوں کہتا ہے ؎

ہم نے الفت کی [illegible] دیکھیں جانیں کیا چشم غضبناک کو ہم

(سبیل السعید ص۲۴)

(۹۱) اختلاف رویت قمر کی صورت میں لیلۃ القدر کے متعدد ہونے کا شبہ اور اس کا جواب

اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کو خبر بھی ہے کہ وہاں رات دن نہیں ہیں اور یہ تو خود سائنس والے

بھی تسلیم کرتے ہیں کہ لیل ونہار کرۃ النسیم سے نیچے ہی نیچے ہیں۔ کرۃ النسیم کے اوپر رات دن نہیں بلکہ یکساں حالت ہے یہ جواب جب میرے دل میں آیا بڑی خوشی ہوئی اور اس سے ایک بات ابھی اور دل میں آئی ہے وہ یہ کہ معراج کے ذکر میں اللہ تعالیٰ نے مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کی سیر بیان فرمائی ہے۔ سیر سموات کا ذکر نہیں فرمایا۔ جس سے بعض اہل باطن نے سیر سموات کی نفی پر استدلال کیا ہے تو وہاں سیر سموات کا ذکر اس واسطے نہیں کیا کہ وہاں لیلاً کی قید بھی مذکور ہے پس ضروری ہوا کہ اسی قدر سیر بیان کی جائے جو لیل کے اندر واقع ہوئی اور ظاہر کہ ہے کہ سیر سموات لیل ونہار سے باہر ہوئی ہے سموات میں لیل ونہار کا تحقق ہی نہیں تو اس سے سیر سموات کی نفی پر استدلال محض لغو ہے ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ سیر سموات رات میں نہیں ہوئی۔ سو یہ مسلم ہے بلکہ ہم تو یوں کہتے ہیں کہ وہ تو نہ دن میں ہوئی نہ رات میں وہ تو ایسے مقام پر ہوئی ہے جہاں رات ہے نہ دن۔ بہرحال وہاں لیل ونہار نہیں ہے اس واسطے لیلۃ القدر کی جو شان وبرکات ہیں وہ لیل ونہار کے ساتھ مقید نہیں۔ بلکہ ارادۂ حق کے تابع ہیں۔ تو اس کی مثال بارش کی طرح ہے کہ یہاں کے کرۃ النسیم کے نیچے آج بارش ہے اور کلکتہ کے کرۃ النسیم کے نیچے کل بارش ہے اگر شب قدر بھی ایسی ہی ہو کہ آج یہاں ہے اور کلکتہ میں کل ہے تو اس میں اشکال کی کیا بات ہے۔ آخر بارش میں کیا ایسا اختلاف نہیں ہوتا۔ پھر معنوی بارش کے برکات میں ایسا اختلاف ہو تو کیا تعجب ہے اس لئے بے فکر ہو کر آپ اپنی ہی تاریخوں کے حساب سے کام کیجئے۔ اللہ تعالیٰ تو سب کی نیتوں اور کام کو دیکھتے ہیں۔ وہ سب کو ان کے حساب کے موافق لیلۃ القدر کی برکات عطا فرما دیں گے۔ (الکمال العدۃ ص۲۸)

(۹۲) محض کتابیں دیکھ کر ہی اپنی اصلاح نہیں ہوسکتی

میں کتابوں کو بیکار نہیں کہتا۔ وہ بیشک کام کی ہیں مگر طبیب کے کام کی ہیں مریض کے کام کی نہیں۔ کتب طب سے کوئی مریض اپنا معالجہ نہیں کرسکتا حالانکہ کتابوں میں سب کچھ موجود ہے اور طبیب ان ہی سے علاج کرتا ہے مگر تم نہیں کرسکتے اگر معمولی مرض کا علاج کر بھی لیا تو شدید امراض کا علاج تو کبھی نہیں کرسکتے چنانچہ بحران کی بحث گو طب کی کتابوں

میں مذکور ہے مگر اس کو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا یہ بحث اس قدر لطیف اور دقیق ہے کہ اطبار حال نے یعنی ڈاکٹروں نے تو گھبرا کر اس کا انکار ہی کر دیا کہ بحران کوئی چیز نہیں۔ مگر اطبارِ قدماء نے اس بحث کو بڑی خوبی سے ضبط کیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اس بحث کا الہام ہوا ہے چنانچہ انہوں نے بخار کے ایام کی تقسیم کی ہے کہ بعض ایام میں طبیعت ومرض میں مقابلہ ہوتا ہے طبیعت ان ایام میں مرض کو دفع کرنا چاہتی ہے اور مرض طبیعت کو دبانا چاہتا ہے۔ اس کیفیت ومقاومت کا نام بحران ہے پھر ان ایام میں بعض دن تو سخت بحران کے ہیں اور بعض دن ہلکے بحران کے ہیں۔ اسلئے مریض کو اور اس کے تیمارداروں کو چاہیئے کہ جب کسی کو بخار آوے اس کا دن اور وقت یاد رکھیں تاکہ طبیب سے بیان کرسکیں اور طبیب کو ایام بحران کی رعایت آسان ہو۔ بھلا محض کتاب دیکھ کر ان امور کی رعایت مریض سے کیونکر ہوسکتی ہے ہرگز نہیں ہوسکتی۔

حضرت کا اپنا واقعہ

بلکہ میں تو تجربہ سے کہتا ہوں کہ مریض اپنے معالجہ میں معمولی امراض کے اندر بھی غلطی کھائے گا۔ چنانچہ مجھے پہلے ہر سال برسات کے اخیر میں بخار آیا کرتا تھا۔ اب تو بحمداللہ بہت سالوں سے نہیں آیا۔ اور ہمیشہ صفراوی بخار ہوتا تھا۔ میں نے ایک دفعہ خیال کیا کہ مجھے غلبہ صفرا سے بخار ہوتا ہے اور حکیم صاحب ہر سال قریب قریب ایک ہی نسخہ لکھتے ہیں لاؤ اس کو نقل کرلیں۔ جب بخار آیا کرے گا اس کو استعمال کرلیا کریں گے حکیم صاحب کو تکلیف دینے کی ضرورت نہ ہوگی چنانچہ ایک سال ایسا ہی کیا کہ پچھلے سال کا لکھا ہوا نسخہ خود ہی استعمال کرلیا مگر چند روز استعمال کرنے سے بھی خاک نفع ہوا۔ آخرکار حکیم صاحب کو بلایا انہوں نے نسخہ لکھا اس کے پینے سے آرام ہوگیا پھر تحقیق ہوئی کہ اس سال صفرا کے ساتھ بلغم صاحب بھی تشریف لے آئے ہیں کیونکہ اب بڑھاپے کا سن شروع ہوگیا۔

اب اگر میں اس نسخہ کی بھی نقل کرلیتا کہ چلو اس میں صفرا اور بلغم دونوں کی رعایت ہے تو یقیناً اس سے بھی اگلے سال نفع نہ ہوتا بلغم ہی بڑھتا۔ (یعنی بلکہ تکلیف وغم ہی زیادہ ہوتا۔ یہ "بل غم" مرکب ہے مفرد نہیں) کیونکہ اس کا مجھے اندازہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اس سال بلغم صفرا سے زیادہ ہے یا مساوی ہے یا کم ہے اس کا اندازہ تو طبیب

ہی کرسکتا ہے جو نبض کی حالت کو پہچانتا ہے اس لئے کتب طب سے معالجہ کرنا طبیب ہی کا کام ہے اسی طرح احیاء العلوم و فتوحات مکیہ جو تصوف کی کتابیں ہیں بیکار نہیں بلکہ کارآمد ہیں مگر شیخ کے کام کی ہیں طالب کے کام کی نہیں طالب کو تو اپنے معالجہ کے لئے کسی محقق کا اتباع لازم ہے ۔ (الرغبۃ المرغوبۃ ص۲۱)

(۹۳) نفع متعدی[1] کا علی الاطلاق نفع لازمی[2] سے افضل ہونا درست نہیں

اصل یہی ہے کہ نفع لازمی نفع متعدی سے افضل ہے کیونکہ آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو امر ہے کہ جب آپ نفع متعدی سے فارغ ہوجائیں یعنی تبلیغ سے تو نفع لازمی میں مشغول ہوں یعنی توجہ الی اللہ میں یہ سیاق صاف بتلا رہا ہے کہ نفع لازمی متعدی سے افضل ہے کیونکہ متعدی سے فارغ کو طلب کیا گیا ہے نہ کہ لازمی سے پھر اس کے بعد نفع لازمی میں اشتغال کلی کا حکم ہے کہ اس میں توجہ رکھئے ۔ اس وقت دوسری طرف التفات نہ ہو جیسا اِلٰی رَبِّکَ کی تقدیم کا مقتضیٰ ہے اور ظاہر ہے کہ اگر نفع متعدی افضل ہوتا تو اس سے فراغ مطلوب نہ ہوتا بلکہ یوں ارشاد ہوتا ۔ فاذا فرغت من ذکر ربك فانصب فی التبلیغ والیہا فارغب نیز نفع لازمی میں مشغول ہونے کے وقت نفع متعدی سے قطع نظر کا امر ہوتا جیسا تقدیم معمول کا مدلول ہے کیونکہ مقصود بالذات سے کسی وقت قطع نظر نہیں ہوا کرتی ۔ اس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ نفع متعدی مقصود بالعرض اور نفع لازمی مقصود بالذات ہے ۔ اور گو یہ مشہور کے خلاف ہے مگر حقیقت یہی ہے اور قول مشہور کا منشا ریا تو یہ ہوا ہے کہ بعض جگہ نفع متعدی نفع لازمی سے اوکد[3] و اقدم[4] ہوگیا ۔ مگر اس سے فضیلت بالذات لازم نہیں آتی ۔ بلکہ اقدمیت

[1] دوسرے کو نفع پہونچانا۔ [2] خود اپنے لئے نفع حاصل کرنا۔ [3] زیادہ تاکید والا۔
[4] سب سے مقدم (پہلے)

واوکدیت ایک عارض کی وجہ سے ہوئی ہے کہ وہ نفع متعدی پھر نفع لازمی کی طرف مفضی ہوگا کہ دوسرا شخص بھی رغبت الی اللہ کرے گا ۔ اور ذکر و صلوٰۃ میں مشغول ہوگا اور اگر اس پر کوئی یہ شبہ کرے کہ شاید نفع متعدی اس لئے مشروع ہوا کہ وہ نفع لازمی کے بعد پھر متعدی کی طرف مفضی ہو ۔ اس طرح کہ دوسرا شخص بھی اپنی اصلاح کرکے تبلیغ کے قابل ہوگا ۔

اپنی اصلاح مقدم ہے

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً تو تبلیغ کے قابل بھی وہ نفع لازمی حاصل کرنے کے بعد ہوگا کیونکہ جس کی خود اصلاح نہ ہوئی ہو وہ دوسروں کی اصلاح نہیں کرسکتا ۔ پھر دوسرے کا تبلیغ کے قابل ہونا یقینی نہیں کیونکہ بعض لوگ اصلاح و تکمیل وغیرہ کے اہل نہیں ہوتے اور نفع لازمی کا اہل ہر شخص ہے ۔ پس نفع متعدی پر نفع لازمی کا ترتب یقینی ہے کہ آج ہی سے اس کا ترتب شروع ہوجاتا ہے نفع متعدی کا ترتب موہوم ہے کہ نہ معلوم یہ دوسروں کی اصلاح کے قابل ہوگا یا نہیں اور تجربہ یہ ہے کہ دوسروں کی اصلاح کے قابل سو میں سے ایک دو ہوتے ہیں ۔

پھر قابل ہوا بھی ۔ تو نہ معلوم کب ہوگا اور ہو گیا بھی ، تو نہ معلوم اس کو اصلاح غیر کی نوبت آئے گی یا نہیں کیونکہ بہت سے سالک نفع متعدی کے قابل ہوتے ہیں مگر ان کو اس کی نوبت ہی نہیں آتی یا کم آتی ہے تو ایسے نفع موہوم کے لئے کسی شئے کا ایسا مشروع ہونا کہ وہ مقصود بالذات ہوجائے ۔ از بس بعید ہے ہاں یہ ممکن ہے کہ بالعرض یہ بھی مقصود ہوجائے لیکن مقصود بالذات وہی نفع ہو سکتا ہے جس کا ترتب یقینی ہو اور اس کا ظہور بھی موہوم نہ ہو اور وہ نفع لازمی ہے جو نفع متعدی پر فوراً ہی مرتب ہونا شروع ہوجاتا ہے دوسرے اگر نفع سے مقصود نفع متعدی ہوگا تو طالب کو اس مقصودیت کی اطلاع کے بعد اس کے قصد کی اجازت بھی ہوگی ۔ کیونکہ مقصود کا ارادہ بھی مقصود ہوتا ہے اور مقصود کی نیت مضر تو ہو ہی نہیں سکتی ۔ مگر شیوخ محققین سے جو کہ مجتہدین فن ہیں جن کا فتویٰ قواعد فن سے حجت ہے ان سے پوچھئے کہ وہ طالب کو نفع متعدی کی نیت کی اجازت بھی دیتے ہیں یا نہیں ۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر طالب ذکر و شغل سے مخلوق کو نفع پہنچانے کا قصد کرے گا تو اس کو کبھی فتحیاب نہ ہوگا یہ ارادہ راہ زن طریق ہے اپنی اصلاح کے زمانہ میں اس کو صرف اپنی اصلاح کا قصد کرنا چاہیئے دوسروں کی اصلاح کا خیال

مانع طریق بلکہ قاطع طریق ہے اس سے اپنی اصلاح کے لالے پڑجاتے ہیں تو یہ اچھا مقصود بالذات ہوا۔ جس کا قصد کرنا راہ زن طریق ہے۔ اب تلائیے اس حالت میں نفع متعدی کو افضل اور مقصود بالذات کیسے کہہ سکتے ہیں۔ پھر اپنی اصلاح کو تکمیل کے بعد بھی ہر شخص کو نفع متعدی کی اجازت نہیں۔ بلکہ اس کا اہل صرف وہی ہے جس کو مشائخ نے اجازت دی ہو اگر نفع متعدی اصل ہے اور یہی مقصود بالذات ہے تو تکمیل کے بعد اس کو از خود نفع متعدی میں مشغول ہونے سے کیوں روکا جاتا ہے اور اجازت شیخ کی قید کیوں لگائی جاتی ہے یہ بھی اس کی دلیل ہے کہ، نفع متعدی مقصود بالذات نہیں ورنہ لازم آتا ہے کہ جن لوگوں کو نفع متعدی کی اجازت نہ دی گئی ہو وہ سب کے سب ناقص ہی ہوں حالانکہ مشائخ کے نزدیک یہ بالکل غلط ہے۔ وہ تصریح کرتے ہیں کہ کمال مقصود کا حصول اس امر پر موقوف نہیں۔

اجازت کی قید کی وجہ

اور قید اجازت کا یہ راز ہے کہ امر بالمعروف کے لئے کچھ آداب ہیں جن کے قابل ہر ایک نہیں ہوتا۔ مثلاً بعضوں کو سیاست وتدبیر کا ملکہ نہیں ہوتا جس کے بغیر امر بالمعروف بجائے مفید ہونے کے موجب فتنہ و فساد ہو جاتا ہے۔ اس لئے بعض لوگوں کو گو وہ درجہ کمال کو پہونچ چکے ہوں ارشاد وتلقین و نفع متعدی کی اجازت نہیں دی جاتی مگر اس سے ان کے کمال کی نفی نہیں ہوئی۔ حالانکہ نفع متعدی کا مقصود بالذات ہونا اس صورت میں نفی کمال کو مستلزم ہے جو اجماع محققین کے خلاف ہے دوسرے میں پوچھتا ہوں کہ اگر نفع متعدی مقصود بالذات ہے تو حربی دار الحرب میں اسلام لائے اور نفع متعدی پر قادر نہ ہو تو تلائیے وہ کیا کرے نفع لازمی کو لازم پکڑے یا نفع متعدی کو۔ اگر نفع متعدی میں مشغول ہونا لازم کیا گیا تو تکلیف مالایطاق، اور اگر نفع لازمی کا اس کو امر کیا گیا تو ثابت ہوا کہ نفع متعدی مقصود بالذات نہیں کیونکہ مقصود بالذات سے کوئی مسلمان محروم نہیں ہو سکتا یہ سب اس امر کے دلائل ہیں کہ نفع متعدی مقصود بالذات نہیں بلکہ مقصود بالعرض ہے۔ اور مقصود بالذات مقصود بالعرض سے افضل ہوا کرتا ہے۔

(الرغبۃ المرغوبہ ص۴۶)

(۹۴) جبرئیل کا فرعون کے ڈوبنے کے وقت اس کے منہ میں مٹی ٹھونسنا

اس کا علماء نے یہ جواب دیا ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو معلوم تھا کہ عذاب دیکھنے کے بعد توبہ قبول نہیں ہوتی۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ إِيمَانُهُمْ لَمَّا رَأَوْا بَأْسَنَا[1]۔ تو وہ اسلام سے نہ روکتے تھے صورت اسلام سے روکتے تھے جس پر گو رحمت فی الآخرت مرتب نہیں ہوتی مگر رحمت فی الدنیا متوجہ ہو سکتی ہے جیسے منافقین صورت اسلام کے سبب قتل اور قید ہونے سے محفوظ رہے۔ اسی طرح احتمال تھا کہ وہ بھی غرق وہلاک سے بچ جاتا۔ پھر اس پر اگر کوئی یہ سوال کرے کہ اس وقت آیت میں بأسنا سے مراد عذاب دنیا تو ہے نہیں کیونکہ عذاب دنیا کی رویت قبل انکشاف آخرت قبول ایمان سے مانع نہیں۔ اور ظاہراً یہاں عذاب آخرت کا انکشاف نہ ہوا تھا ورنہ دنیا کی طرف کا احساس بالکل باطل ہو جاتا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ مسلم نہیں بلکہ انکشاف آخرت کے بعد بھی ادھر کا احساس باقی رہنا ممکن ہے۔ چنانچہ بعض محتضرین کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے فرشتوں کو بھی دیکھا۔ اور اس کے ساتھ اپنے گھر کی عورتوں کو بھی پہچانا۔ چنانچہ گھر والوں سے کہا کہ فرشتے بیٹھے ہیں تم ان سے پردہ کرو۔ تو ابتدا انکشاف کے ساتھ ادھر کا ہوش رہ سکتا ہے۔

فرعون کا ایمان لانا

اور فرعون کے واقعہ سے ظاہراً بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے جس وقت ایمان ظاہر کیا ہے اس وقت اس کو انکشاف آخرت کے ساتھ دنیا کے بھی ہوش تھے چنانچہ اس کا قول آمَنْتُ بِالَّذِي آمَنَتْ بِهِ بَنُو إِسْرَائِيلَ[2] تلا رہا ہے کہ اس وقت اسرائیل کا

---

[1] جب وہ ہمارا عذاب دیکھیں گے تو ان کا ایمان لانا ان کے لئے نافع نہ ہوگا۔ [2] میں اس ذات پر ایمان لایا جس پر بنو اسرائیل ایمان لائے۔

حق پر ہونا اور ان کا مومن ہونا اس کے خیال میں تھا اور یہ دنیا کا واقعہ ہے تو اس کو ادھر کے ہوش ضرور تھے لیکن اوپر معلوم ہو چکا کہ یہ انکشاف عذاب آخرت کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے پس اس دلیل سے عذاب آخرت کی نفی نہیں ہو سکتی اور یہ انکشاف مانع ہے قبول ایمان سے۔ پس اشکال رفع ہو گیا۔ اب ایک سوال رہ گیا کہ جب یہ حالت مانع ہے قبول ایمان اور ایمان نام ہے تصدیق کا اور وہ بعد انکشاف آخرت کے مقبول نہ تھی اگرچہ زبان سے تلفظ کیا جا دے تو پھر تلفظ سے روکنے سے کیا فائدہ ہوا۔ اور اگر زبان سے اقرار کرنا کسی درجہ میں مفید بھی مان لیا جا دے تو اقرار کا قصد بھی کافی ہونا چاہیئے اگرچہ کسی عذر سے عجز ہو گیا ہو۔ اور یہاں عجز ہو گیا کیچڑ کی وجہ سے تو وہ اقرار مفید متحقق ہو گیا۔ پھر کیچڑ ٹھونسنے سے کیا فائدہ ہوا۔

فرعون کی نعش کا محفوظ رہنا

سو اس کا جواب وہی ہے جو اوپر گذرا کہ جبرئیل علیہ السلام نے ظاہری رحمت کو بھی اس کے لئے گوارا نہیں کیا اگرچہ رحمت ظاہری کا ایک گو نہ ظہور نعش کو محفوظ رکھنے سے ہو گیا جیسا کہ ارشاد ہے۔ فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ[1] (الآیۃ) مگر اس پر بھی ایک سوال ہے کہ اس ظاہری رحمت میں ان کا کیا حرج تھا۔ اس کا جواب وہی ہے۔ جس کو میں ذکر کر رہا ہوں کہ اس فعل کا منشا غلبۂ بغض فی اللہ تھا۔ اس میں یہ بھی گوارا نہ ہوا۔ اور مبغوض حق سے ایسا بغض بدون غلبۂ عشق حق کے ہو نہیں سکتا۔

(العید والوعید ص۱)

(۹۵) خدا تعالیٰ کی پیشین گوئی کسی امر کے متعلق اس کو لازم نہیں کہ وہ غیر اختیاری ہو جائے

میرے پاس اس کی دلیل موجود ہے جو چند مقدمات پر مبنی ہے۔ ایک مقدمہ

[1] پس میں نے تجھے آج تیرے بدن کے ساتھ نجات دی۔

تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ فعل عبث سے پاک ہیں اور دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ محقق طبیب بعد مایوسی کے دوا نہیں دیا کرتا اور اگر دیتا ہے بھی تو مریض کو مجبور نہیں کرتا بلکہ بعض تو صاف کہہ دیتے ہیں کہ یہ مریض بچے گا نہیں اس کو دوا مت دو اور اگر کوئی محقق اس حالت میں بھی جبراً دوا دیتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو علم غیب نہیں۔ وہ اپنے قواعد طبیہ سے اس مرض کو لاعلاج سمجھتا ہے۔ مگر سمجھنا ظنی ہے قطعی نہیں وہ قدرت خدا پر نظر کر کے امیدوار ہے

؎ عقل در اسباب میدارد نظر عشق می گوید مسبب را نگر

مگر حق تعالیٰ تو علم غیب ہے اگر ختم اللہ علیٰ قلوبھم سے ان لوگوں کے لاعلاج ہونے اور علاج کے غیر اختیاری ہونے پر دلالت ہوتی۔ تو یہ دلالت قطعی ہوتی کیونکہ عالم الغیب کا کلام ہے اور نفی اختیار کے ہوتے ہوئے یہ محال ہے کہ دوا پر جبر کیا جاوے کیونکہ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا کے خلاف ہے۔ تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ان لوگوں کو دوا پر مجبور کیا ہے يَا اَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ میں خطاب عام ہے اور یہ آیت مکی ہے پھر لفظ یا ایہا الناس خود عموم کو بتلا رہا ہے جس میں تمام کفار کو توحید و ایمان اختیار کرنے کے متعلق خطاب ہے جن میں وہ لوگ بھی تھے جن کے بارہ میں ختم اللہ علیٰ قلوبھم فرمایا گیا ہے پھر اس پر اجماع ہے کہ ابوجہل و ابولہب وغیرہ ایمان کے مکلف نہ ہوں اور اس حکم سے مستثنیٰ ہوں تو پھر ان کو عذاب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ یہ کہہ سکیں گے کہ حضور ہم کو جو ترک ایمان اور کفر کی وجہ سے جو ہم کو عذاب ہو رہا ہے تو آخر زمانہ میں ہم تو حکم ایمان سے مستثنیٰ ہو گئے تھے آپ نے ختم اللہ علیٰ قلوبھم نازل فرما دیا تھا حالانکہ ان کا معذب ہونا منصوص ہے کیونکہ ختم اللہ علیٰ قلوبھم کے ساتھ ہی ولھم عذاب عظیم بھی وارد ہے پس یہ ماننا پڑے گا کہ جن کے بارہ میں ختم اللہ علیٰ قلوبھم فرمایا گیا ہے ایمان کے مکلف وہ بھی تھے اس لئے مستثنیٰ نہ تھے۔ اب میرا دعویٰ ثابت ہو گیا کہ جن لوگوں کے متعلق ختم اللہ علیٰ قلوبھم نازل ہوا ہے ان کا مرض روحانی لاعلاج نہ تھا۔ اگر روحانی مطب میں کوئی مایوس العلاج ہوتا تو یہ لوگ ہوتے مگر وہ بھی مایوس العلاج نہیں تو ثابت ہو گیا کہ مرض روحانی کسی کا بھی لاعلاج نہیں۔ رہا یہ سوال کہ پھر پیشین گوئی کی کیا ضرورت تھی۔ جواب یہ ہے کہ ایک راز تھا جو حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلا دیا۔ مگر اس کا بھی مطلب یہ ہے۔ لا یومن ابوجہل ونحوہ مع بقاء اختیارہ۔ کہ یہ لوگ ایمان نہ لائیں گے مگر یہ ایمان نہ لانا

ان کے اختیار سے ہوگا یہ مطلب نہیں کہ ان کو ایمان پر قدرت و اختیار ہی باقی نہیں رہا۔ خوب سمجھ لو اس سے زیادہ کلام کرنا۔ فعل فی القدر ہے جس کی اجازت نہیں۔ غرض یہ بات ثابت ہوگئی کہ نصوص میں کسی امر کی پیشین گوئی وارد ہونے سے اس کا خارج از اختیار ہونا لازم نہیں آتا۔ اور جب وہ اختیار . . . سے خارج نہیں تو اس کی تدابیر کرنا فضول نہیں ورنہ اگر پیشین گوئی مانع تدبیر ہو تو چاہیئے کہ آج سے قرآن کے حفظ کو ترک کر دیا جائے کیونکہ قرآن میں پیشین گوئی ہے۔ انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحافظون جسمیں حفاظت قرآن کا وعدہ ہے تو پھر نعوذ باللہ قرآن کا پڑھنا بھی چھوڑ دو لکھنا بھی چھوڑ دو چھاپنا بھی چھوڑ دو۔ اور جو لکھے ہوئے رکھے ہیں ان کو دفن کر دو اور کہدو کہ بس قرآن کا حافظ اللہ ہی کافی ہے ایک ہی حافظ بہت ہے اور وہ حافظ بھی کیسا جو محافظ بھی ہے جتنے طریقے حفاظت کے ہیں وہ سب خود ہی کرلیں گے کیونکہ انا لہ لحافظون میں سب طریقے آ گئے۔ مگر مسلمانوں نے آج تک ایسا نہیں کیا حالانکہ یہاں بھی تو پیشین گوئی ہوچکی ہے پھر اس کی کیا وجہ کہ یہاں تو آپ نے یہ تجویز کیا کہ قرآن کو حفظ بھی کیا اور لکھا بھی اور چھاپا بھی اور ان سب باتوں کو اپنے اوپر فرض بھی سمجھا۔ اور نااتفاقی کے متعلق پیشین گوئی ہوچکی ہے تو اب علاج کی کیا ضرورت ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جب حفاظت قرآن کا وعدہ ہوچکا ہے تو پھر آپ کی حفاظت کی کیا ضرورت ہے۔ آپ پر بھی وہی اعتراض پڑتا ہے جو آپ اس مسئلہ میں ہمارے اوپر کر رہے ہیں۔ اس کا جواب دیجئے۔ آخر دونوں باتوں میں مابہ الفرق کیا ہے۔ فرق کا مبنیٰ تبلائیے۔ اگر آپ نہیں تبلاتے تو لیجئے میں بتلاتا ہوں آپ اس اعتراض کے جواب میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ " انا لہ لحافظون ،، کے معنی یہ ہیں کہ ہم ہر زمانے میں ایسے لوگ پیدا کرتے رہیں گے جو اس کی حفاظت میں سعی کرتے رہیں گے اور ہم حفاظت کے طریقے ان کے قلوب میں ڈال دیں گے۔ کہ وہ اس کو یاد بھی کریں گے لکھیں گے بھی پڑھے پڑھائیں گے بھی جیسا کہ حفاظت قرآن کی پیشین گوئی کے بعد اپنی آپ کی حفاظت کو بھی اس میں دخل ہے۔ اسی طرح نااتفاقی کی پیشین گوئی کے بعد بھی آپ کی بدپرہیزی کو اس میں دخل ہے اور پیشین گوئی کے بھی یہ معنی ہیں کہ چونکہ یہ لوگ باختیار خود بدپرہیزی کریں گے اس لئے نااتفاقی رہے گی۔ پس یہ بات ثابت ہوگئی کہ خدا اور رسول کا کسی چیز کے متعلق پیشین گوئی کرنا اس کو مستلزم نہیں کہ وہ دائرہ تکلیف سے باہر ہوجاوے اور اس کی تدبر نہ کی جاوے اور اس کا راز وہی ہے۔ جو

میں نے شروع میں کہا تھا کہ پیشین گوئی کبھی مرض کے لاعلاج ہونے سے کی جاتی ہے اور کبھی مریض کے بدپرہیز ہونے کی وجہ سے اور امراض روحانیہ میں لاعلاج کوئی مرض نہیں یہاں جو پیشین گوئی ہوئی ہے مریض کے بدپرہیز ہونے کی وجہ سے ہوئی ہے۔

(الانداد ص۸)

(۹۶) خلافت فاروقیہ کو خلافت صدیقیہؓ سے کثرت فتوحات کی وجہ سے افضل سمجھنا غلط ہے

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں جدید فتوحات کچھ زیادہ نہ ہوئی تھیں بلکہ ان کی خلافت کا زیادہ زمانہ خود مسلمانوں کو سنبھالنے میں صرف ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد بعض قبائل مرتد ہوگئے تھے کچھ لوگوں نے زکوٰۃ کی فرضیت کا انکار کر دیا تھا۔ تو حضرت صدیق اکبرؓ کا زمانۂ خلافت اس فتنۂ ارتداد کے فرو کرنے اور مسلمانوں کی حالت سنبھالنے میں صرف ہوا۔ مخالفین کے ملک فتح کرنے کی زیادہ نوبت نہ آئی اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں شاید کوئی دن بھی جدید فتوحات سے خالی نہیں رہا۔ روزانہ یہی خبریں آتی تھیں کہ آج فلاں شہر فتح ہوگیا۔ اور کل فلاں شہر پر حملہ ہے، یہاں تک کہ دس سال کے عرصہ میں حکومت اسلامیہ شرقاً و غرباً پھیل گئی

ایک غلط فہمی کا ازالہ

اس لئے بعض کم فہم خلافت عمریہ کو خلافت صدیقیہ سے افضل شمار کرتے ہیں مگر عقلمند خوب جانتے ہیں کہ مکان کی خوبصورتی میں زیادہ کمال اس شخص کا ہے جس نے کہ اول نقشہ تیار کیا تھا اور بنیادیں قائم کی تھیں کیونکہ اس کو بہت دماغ سوزی سے کام کرنا پڑا ہے۔ مکان کا خوبصورت نقشہ بنانا اور بنیاد کا مستحکم کرنا یہ بڑا کام ہے دیواریں قائم کرنیوالے کا اتنا بڑا کمال نہیں کیونکہ وہ تو اینٹ پر اینٹ رکھتا چلا گیا اس کو کونسی دماغ سوزی کرنی پڑی ظاہر میں لوگ دوسرے معمار کی تعریف کرتے ہیں کیونکہ مکان کو اس نے مکمل کیا۔ مگر حقیقت شناش سمجھتا ہے کہ اس مکان کی خوبصورتی بڑا کمال نہیں بڑا کمال نقشہ بنانیوالے

اور بنیاد قائم کرنیوالے کا ہے۔ اسی طرح جو اسرار شناس ہیں وہ جانتے ہیں کہ خلافتِ صدیقیہ سے خلافتِ عمریہ کو کوئی بھی نسبت نہیں۔ کیونکہ حضرت صدیق اکبرؓ کو حکومت اسلامیہ اور خلافت کی بنیاد قائم کرنے میں جو تعب برداشت کرنا پڑا ہے اس کا عشر عشیر بھی حضرت عمرؓ کو نہیں پیش آیا۔ یہ کام اسی عالی حوصلہ خلیفہ کا تھا کہ ایسے فتنے کے زمانہ میں جب کہ خود اپنی ہی جماعت قبضہ سے باہر ہونا چاہتی تھی تمام فتنوں کا مقابلہ کر کے اور ان کو ایک دم نیست و نابود کر کے ڈھائی سال کے عرصہ میں خلافتِ اسلامیہ کے کھونٹے گاڑ دیئے اور نظام حکومت کو ایسے مستحکم اصول پر قائم کر دیا کہ بعد کے خلیفہ کو کوئی پریشانی ہی نہ پیش آسکے۔ حضرت عمرؓ کی خلافت میں وہ اصول جاری ہو گئے اور نظام صدیقی شائع ہو گیا۔ تو بڑا کمال حضرت صدیقؓ کا ہے۔ اور جس قدر فتوحات حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ہوئی ہیں ان سب کا ثواب حضرت صدیقؓ کے صحیفۂ اعمال میں داخل ہوگا اہل تمدن و سیاست اس کو خوب سمجھتے ہیں کہ قانون جاری کرنے سے زیادہ مشکل قانون بنانا ہے۔ قانون بنانے والے کو جس مشقت کا سامنا ہوتا ہے جاری کرنے والے کو اس کا دسواں حصہ بھی پیش نہیں آتا۔ (الجلاء للابتلاء ص ۹)

(۹۷) کیا چار سو برس کے بعد اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا؟

اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ چار سو برس کے بعد کسی کو اجتہاد کے قابل دماغ نہیں ملا کیونکہ اس پر کوئی دلیل قائم نہیں، علاوہ ازیں یہ مطلقاً صحیح بھی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ہر زمانہ میں ہزاروں ایسی جزئیات نئی نئی پیش آتی ہیں جن کا کوئی حکم ائمہ مجتہدین سے منقول نہیں اور علماء خود اجتہاد کر کے ان کا جواب بتلاتے ہیں پس اگر اجتہاد کا باب بالکل بند ہو گیا ہے اور اب کسی کا دماغ اجتہاد کے قابل نہیں ہو سکتا تو کیا ایسے نئے نئے مسائل کا جواب شریعت سے نہیں ملے گا۔ یا ان مسائل کے جواب کے لئے کوئی نیا نبی آسمان سے اترے گا۔ اگر یہی بات ہے تو خدا خیر کرے کہیں ق، د، ن والے نہ سن لیں۔ کہیں یہ بات ان کے کانوں میں پڑ گئی تو مسیح موعود کے دلائل نبوت کی فہرست میں ایک اور دلیل کا اضافہ کر لیں گے پھر اس آیت کے کیا معنی ہوں گے اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دین کی تکمیل ہو چکی۔ کہ دروازہ اجتہاد اگر بالکل بند کر دیا جائے تو پھر شریعت کی تکمیل کس طرح مانی جائے گی

کیونکہ ظاہر ہے کہ بہت سے مسائل ایسے ہیں کہ ان کا جواب کتب فقہ میں مذکور نہیں نہ ائمہ مجتہدین سے کہیں منقول۔

نئے مسائل کے جوابات

پچھلے دنوں میں ایک سوال آیا تھا کہ ہوائی جہاز میں نماز ہو سکتی ہے یا نہیں اب تلائیے کہ اگر اجتہاد بعد چار سو برس کے بالکل جائز نہیں تو اس مسئلہ کا شریعت میں کوئی بھی جواب نہیں پہلے زمانہ میں نہ ہوائی جہاز تھا نہ فقہاء اس کو جانتے تھے۔ نہ کوئی حکم لکھا۔ اب ہم لوگ خود اجتہاد کرتے ہیں۔ اور ایسے ایسے نئے مسائل کا جواب دیتے ہیں تو فقہاء رحمہم اللہ کے اس قول کا یہ مطلب نہیں کہ چار سو برس کے بعد اجتہاد بالکل بند ہو گیا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اجتہاد فی الاصول کا دروازہ بند ہو گیا اور اجتہاد فی الفروع اب بھی باقی ہے اور قیامت تک باقی رہے گا اگر اجتہاد فی الفروع بھی نہ ہو سکے تو شریعت کے نامکمل ہونے کا شبہ ہوگا جو کہ بالکل غلط ہے شریعت میں کسی قسم کی کمی نہیں قیامت تک جس قدر صورتیں پیش آتی رہیں گی سب کا جواب علماء ہر زمانہ کی شریعت سے نکالتے رہیں گے کیونکہ یہ جزئیات اگر کتب فقہ میں نہیں تو اصول و قواعد سب سے پہلے مجتہدین بیان کر چکے ہیں جن سے قیامت تک کے واقعات کا حکم معلوم ہو سکتا ہے۔

اجتہاد فی الاصول کی بندش

البتہ قرآن و حدیث سے اصول مستنبط کرنا یہ اب نہیں ہو سکتا یہ خاص اجتہاد فی الاصول بعد چار سو برس کے ختم ہو گیا کیونکہ اول تو جس قدر اصول و قواعد شریعت کے تھے وہ سب ائمہ مجتہدین بیان کر چکے انہوں نے کوئی قاعدہ چھوڑ نہیں دیا۔ دوسرے ان کے بعد اگر کسی نے اصول مستنبط بھی کئے تو وہ مستحکم نہیں۔ کہیں نہ کہیں ضرور ٹوٹتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اجتہاد فی الاصول کے لئے اب دماغ قابل ہی نہیں رہے یہ حضرات مجتہدین ہی کا خاص حصہ تھا کہ انہوں نے نصوص سے اس خوبی سے اصول مستنبط کئے جو کہیں نہیں ٹوٹ سکتے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ ہدایہ کے اصول مسلم نہیں اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہدایہ غیر معتبر کتاب ہے اس میں اصول غلط نقل کر دیئے گئے ہیں۔ بلکہ شاہ صاحب کی مراد یہ ہے کہ صاحب ہدایہ نے بعض اصول خود شریعت سے مستنبط کئے ہیں جن میں وہ ناقل نہیں ہیں سو وہ معتبر

نہیں باقی جزئیات اس کی سب معتبر ہیں۔ تو اب دیکھ لیجئے کہ صاحب ہدایہ باوجودیکہ بہت ہی بڑے شخص ہیں ان کی علمی شان ہدایہ ہی سے معلوم ہوسکتی ہے۔ واقعی اس کتاب میں بھی انہوں نے کمال کردیا ہر مسئلہ کی دو دلیلیں بیان کرتے ہیں ایک عقلی۔ ایک نقلی۔ کیا ٹھکانا ہے وسعت نظر کا کہ جزئیات تک کو حدیث سے ثابت کرتے ہیں پھر حدیثیں گو بلا سند بیان کرتے ہیں مگر تفتیش کرنے سے کہیں نہ کہیں ضرور ملتی ہیں چاہے مسند بزاز میں ہوں یا مسند عبدالرزاق میں۔ بیہقی میں ہوں یا مصنف ابن ابی شیبہ میں۔ کہیں ضرور ملیں گی ایک دو اگر نہ ملیں تو ممکن ہے مگر جس شخص کی نظر اس قدر وسیع ہو تو ایک دو حدیث جو ہم کو نہ ملی ہو اس سے یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ اس کی اصل ہی نہیں۔ یہ تو وسعت نظر کا حال ہے فہم کا تو کیا ٹھکانا ہے مخالفین کے دلائل کو بیان کرنا ان کا جواب دینا پھر اپنے مذہب کی دلیل بیان کرنا یہ ان کا خاص حصہ ہے مگر بایں ہمہ جو اصول کو خود حدیث و قرآن سے نکالتے ہیں ان کی بابت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے فیصلہ فرمادیا کہ وہ معتبر اور مسلم نہیں ہیں کہیں نہ کہیں ضرور ٹوٹتے ہیں تو آجکل جن لوگوں کی وسعت نظر و فہم کو صاحب ہدایہ سے کچھ بھی مناسبت نہیں وہ کیا حدیث و قرآن سے اصول مستنبط کریں گے۔

اجتہاد فی الفروع باقی ہے

ہاں البتہ اجتہاد فی الفروع اب بھی باقی ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آسکتا کہ ہم بھی امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کی طرح مجتہد ہوگئے کیونکہ اصحاب سیاست خوب جانتے ہیں کہ قانون بنانا قانون جاری کرنے سے بہت زیادہ دشوار ہے ہم لوگ سوائے اس کے کہ ان حضرات کے استنباط کردہ اصول کو حوادث الفتاویٰ میں جاری کردیں اور کیا کرسکتے ہیں۔ کمال انہیں حضرات کا تھا کہ انہوں نے حدیث و قرآن میں غور کرکے ایسے اصول و قواعد سمجھے جو قیامت تک کے جزئیات کے لئے کافی ہیں کوئی مسئلہ ایسا پیش نہیں آسکتا جس کا حکم جواز و عدم جواز ان اصول سے نہ نکلتا ہو بلکہ ان حضرات نے صرف اصول و قواعد ہی پر اکتفا نہیں کیا۔ جزئیات بھی اس قدر نکال کر بیان کرگئے ہیں کہ بہت ہی کم کوئی مسئلہ ہوتا ہے جس کو وہ صراحۃً یا دلالۃً بیان نہ کرگئے ہوں اور اگر کوئی شاذ و نادر ایسا مسئلہ معلوم ہوتا ہے جو فقہاء نے نہیں بیان کیا تو کبھی تو مفتی کی نظر کی کوتاہی ہوتی ہے کہ اس کو سب مواقع پر عبور نہیں ہوتا۔ یا فہم کی کمی ہوتی ہے کہ وہ مسئلہ عبارت سے نکل سکتا ہے مگر مفتی صاحب

کی سمجھ میں نہیں آیا اور اگر بالفرض جزئیہ انہوں نے نہیں بیان کیا تو اصول سے تو وہ ضرور ہی مستنبط ہوتا ہو گا پس آجکل یہ کسی کا منہ نہیں کہ اپنے کو ائمہ مجتہدین کے برابر کرسکے۔

(الجلاء للابتلاء ص۱۰)

(۹۸) علم الاعتبار نکات و لطائف کے درجہ میں ہے

اور علوم جو بزرگوں نے قرآن سے نکالے ہیں ان کو یہ کہیں گے کہ منطبق علی القرآن ہیں مدلول قرآن نہیں ہیں یوں کہیں گے ثابت القرآن ہیں ہاں منطبق موافق کہدیں گے۔ اور مدلول اور منطبق میں بڑا فرق ہے ایک مثال سے آپ کو اس کا فرق ظاہر ہو گا فرض کرو کہ ایک شخص کے پاس حجام آیا اور اس نے کہا کہ خط بنوا لیجئے اس نے جواب دیا کہ بڑھنے دو اتفاق سے جس وقت اس نے یہ جواب دیا تھا لڑکے والوں کی طرف سے ڈوم بھی انکی لڑکی کی شادی کا خط لیکر آیا۔ وہ بھی اتفاق سے اس جواب سے اپنا مطلب نکال لے تو یہ جواب "بڑھنے دو" دونوں سوالوں کا ہوسکتا ہے اول اس سوال کا اس طور پر کہ خط بڑھنے دو جب بڑھ جائے گا بنوائیں گے دوسرے سوال کا اس طور پر کہ لڑکی ابھی چھوٹی ہے اس کو بڑھنے دو۔ پہلے معنیٰ کو تو مدلول کہیں گے اور دوسرے کے مدعا پر اس کو صرف منطبق کہیں گے۔ قصد تو یہ تھا کہ نائی کو جواب دیں لیکن یہ کلام کی لطافت ہے کہ وہ ڈوم کا بھی جواب ہو گیا بس اس کو نکتہ اور لطیفہ کہہ سکتے ہیں یہاں سے ایک بات اور کام کی سمجھ میں آئی وہ یہ کہ صوفیہ کرام نے آیات کے متعلق کچھ بصورت تفسیر کے کہا ہے مثلاً اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى کے متعلق لکھا ہے۔ اذهب ایها الروح الی النفس انه طغى واذ بحوا بقرة النفس تو ان تاویلوں کو دیکھ کر دو جماعتیں ہوگئی ہیں ایک تو جو صوفیہ کی محبت سے خالی ہیں اور یحمل النصوص علی ظواهرها کے پورے پابند ہیں انہوں نے تو ان تاویلات کا بالکل انکار کردیا کہ کہاں فرعون کہاں نفس۔ کہاں موسیٰ کہاں روح۔ یہ تو ایسا ہے کہ زمین بول کر آسمان مراد لیلیں اور صوفیہ کو اس بناء پر ضال و محرف کہہ کر ان کے منکر ہوگئے کہ ان کو تو یہ ضرر ہوا کہ حضرات اہل اللہ کے برکات سے محروم ہوئے۔ دوسرے وہ تھے جو ان حضرات کی محبت میں غرق ہیں وہ یہ کہنے لگے

کہ قرآن کا مدلول اور تفسیر یہی ہے علمار ظاہر یہ نہیں سمجھے اس میں تو سارا قصہ باطن کا ہے پھر اس بات میں غالین کا یہاں تک غلو بڑھا کہ بعض جگہ تو انہوں نے قرآن مجید کی گت ہی بنادی ہے۔ واللہ یہ لوگ بالکل ہی برباد ہوئے خدا کی قسم ہے کہ قرآن کا یہ مدلول ہرگز ہرگز نہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روزہ نماز سب اٹھ گیا اس لیے کہ تمام نصوص کے مدلولات کو بلکہ تمام شریعت کو ان لوگوں نے بدل دیا۔ لیکن اس وقت کلام ہے صوفیہ محققین کی تاویلات واشارات میں۔ سو اس میں بعضے تو ان کے ہی منکر ہوگئے اور بعض مفسرین کے منکر ہوگئے۔

ہمارا طریقہ کار

اب رہ گئے ہم بیچ میں کہ ہم قرآن کو کلام اللہ اور صوفیہ کو اہل اللہ جانتے ہیں۔ تو دونوں کی اعانت وحفاظت کے لئے ضرورت ہوئی کہ ان تاویلات کو ایسے معانی پر محمول کیا جاوے کہ کلام اللہ کی بھی تحریف نہ ہو اور اہل اللہ کا کلام بھی خلاف قواعد شرعیہ نہ ہو۔ اس لئے ہم کہتے ہیں کہ صوفیہ کرام نے جو آیات کے معنیٰ بیان کئے ہیں یہ فی الواقع تفسیر نہیں ہے اور نہ وہ حضرات مدلول ظاہری کے منکر ہیں ان کی یہ مراد ہرگز نہیں کہ قرآن میں فرعون سے نفس اور موسیٰ سے روح اور بقرہ سے نفس مراد ہے جو کچھ وہ فرما رہے ہیں یہ علم اعتبار کہلاتا ہے اور علم اعتبار یہ ہے کہ دوسرے کے حال پر اپنے حال کو بھی قیاس کرو اس کی ایسی مثال ہے جیسے زید نے ایک کام عمرو کی دیکھا دیکھی کیا اور اس میں اس کو ناکامی ہوئی۔ تو اس موقع پر کہتے ہیں کہ کوا چلا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا۔ تو اس کلام میں کوے سے مراد زید اور ہنس سے مراد عمرو یقیناً نہیں ہے۔ کوے سے کوا مراد ہے اور ہنس سے ہنس ہی مراد ہے۔ اور حاصل اس کا یہ ہے کہ دو موقعے ایک حالت کے اندر منطابق ہیں۔ ایک موقع پر جو نظر پڑی تو دوسرا موقع اس کو دیکھ کر یاد آگیا اور ایک کو دوسرے کے ساتھ تشبیہ دیدی۔ مثلاً یہاں زید وعمرو اور ان کے قصے کو کوے اور ہنس سے تشبیہ دیدی پس اذہب ایہا الروح الخ سے مراد یہ ہے کہ قاری صاحب تو قرآن پڑھے۔ اور یہاں پہونچے تو اس قصے سے یہ سبق لو کہ تمہارے اندر بھی ایک چیز فرعون کے مشابہ اور ایک چیز موسیٰ کے مشابہ ہے قصے کو قصے ہی کے طور پر مت پڑھو بلکہ قرآن شریف کے ہر ہر موقعہ سے اپنی حالت پر مطابق کرتے جاؤ اور اس سے نصیحت اور عبرت حاصل کرتے جاؤ۔ یہ مطلب ہے صوفیہ کرام کا۔ پس دونوں فرقے غلطی پر ہیں جو ان تاویلات کا بالکل انکار کرتے ہیں وہ بھی غلطی پر ہیں اور جو ان کو تفسیر اور مدلولِ قرآنی قرار دیتے ہیں وہ تو بالکل

ہی گئے گذرے ہیں یہ تاویلات اور لطائف اور نکات کے درجے میں ہیں۔ تفسیر نہیں ہیں اور ان کو علوم قرآنیہ نہیں کہہ سکتے علوم قرآنیہ وہی ہیں جن پر عبارت النص یا اشارۃ النص یا اقتضاء النص یا دلالۃ النص سے استدلال ہو سکے ورنہ وہ نکات ولطائف کا درجہ ہے۔

(الانفاق ص۱۰)

(۹۹) تبلیغ کو سیاسی اغراض کی وجہ سے ترک کرنا جائز نہیں۔

اب دیکھنا چاہئے کہ اس باب میں ہماری کیا حالت ہے اور ہم کو اس طرف توجہ ہے یا نہیں۔ تو غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم کو ادھر بالکل توجہ نہیں۔ اعتقاداً تو اس کو مامور بہ سمجھتے ہیں بلکہ اگر اس میں غور بھی کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جس درجہ کا یہ مامور بہ ہے اس درجہ سے بہت کم سمجھا جاتا ہے اس کو درجہ وجوب میں سمجھنے والے تو بہت ہی کم ہوں گے۔ کوئی مستحب سمجھتا ہے کوئی مستحسن۔ اور غضب یہ کہ مستحسن سمجھنے میں بھی قید لگاتے ہیں کہ مستحسن بھی جب ہے کہ کسی مصلحت سیاسیہ وغیرہ کے خلاف نہ ہو۔ ورنہ وہ بھی نہ دارد۔ اول تو یہی غضب تھا کہ بعض نے واجب کو مستحب سمجھا۔ پھر یہ دوسرا غضب ہے کہ اس میں یہ قید لگادی کہ مصلحت کے خلاف نہ ہو۔ وہ کیوں؟ محض اپنے اغراض کے سبب۔ کیونکہ دینی کاموں میں بھی لوگ اول اغراض کی طرف دیکھتے ہیں کہ مسئلہ ان اغراض کے موافق ہے یا مخالف پھر وہ غرض جہاں فوت ہونے لگی کہدیا کہ اس وقت یہ کام مصلحت کے خلاف ہے لہذا مستحب بھی نہیں رہا۔ اب اس کو اصلاً مامور بہ نہیں سمجھتے بلکہ عجیب نہیں کہ ایک دن کسی مصلحت کی وجہ سے مامور بہ کو منہی عنہ بتلانے لگیں افسوس مسلمانوں سے یہ نہیں ہوتا کہ اغراض کو احکام کے تابع بنائیں کہ اصل تو یہی ہے وہ سرانجام پائے پھر اغراض خواہ حاصل ہوں یا نہ ہوں۔ مگر افسوس یہ نہیں کرتے۔

لوگوں کا حال

بلکہ بعض نے تو اغراض نفسانی کو پورا کرنے کے لئے کہ دعوت الی الاسلام کا نام فتنہ اور فساد رکھا ہے اور یہی وجہ ہے بے رحمی

کی کہ اس میں انہیں اغراض کی وجہ سے بے حد تساہل کرتے ہیں حتیٰ کہ اپنی آنکھ سے بھی دیکھیں کہ کسی نے نماز میں تعدیل ارکان نہیں کی۔ اور ایسے بہت نکلیں گے تو ہماری یہ ہمت نہیں ہوتی کہ اس سے اتنا کہدیں کہ صَلِّ فَاِنَّکَ لَمْ تُصَلِّ۔ اور اس کی وجہ صرف اتباع ہوا ہے اس لئے باوجود علم کے محض دقیق تاویلیں گھڑ لیتے ہیں مگر خدا کے ساتھ یہ حیلہ و تزویر[1] چل نہیں سکتا۔ بل الانسان عَلٰی نفسہ بصیرۃ ولو القیٰ معاذیرہ۔ اگر انصاف سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اصل میں دنیا کو قبلہ و کعبہ بنا رکھا ہے امر بالمعروف نہ کرنے کی وجہ فقط اتنی ہے کہ اس سے دنیاوی اغراض فوت ہوتے ہیں دوستی نہیں رہے گی میل ملاپ نہ رہے گا ہنسی خوشی جاتی رہے گی اگر ہم نے کسی کو ٹوکا تو وہ ناخوش ہو جائے گا پھر ناخوش ہو کے آزار کے درپے ہو جائے گا پھر آزار سے ہم کو تکلیف ہوگی۔ اور یہ آزار و تکلیف بھی سب وہمی ہے۔ ایسے مواقع کے متعلق ذرا علماء سے تو دریافت کر لو کہ صاحب امر بالمعروف میں اگر ایسی ایسی باتیں پیش آئیں تو ایسی حالت میں ہم معذور ہیں یا نہیں۔ ان سے پوچھو تو کون کون سی چیزیں مسقط وجوب امر ہیں۔

امر بالمعروف کے آداب

میں یہ نہیں کہتا کہ اس کا کوئی طریقہ ہی نہیں۔ اس کے لئے کوئی شرط و ضابطہ ہی نہیں ہے۔ برابر ہے اور ضرور ہے مگر شرائط و ضوابط و آداب و اعذار علماء سے دریافت کرو۔ خود مفتی بن کر کیوں فتویٰ لگا لیا کہ ہم تو معذور ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ شرائط آداب کا طالب حقیقی بھی وہی ہو گا جس نے پکا ارادہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا کر لیا ہو۔ اس کو البتہ حق ہے شرائط و ضوابط پوچھنے کا۔ وہ اگر آداب و اعذار معلوم کرے تو اس کو سب کچھ بتلا دیا جاوے گا باقی حالت موجودہ میں جبکہ اس کی طرف توجہ اور التفات ہی نہیں اس حالت میں آپ کو اعذار و شرائط پوچھنے کا اور سمجھنے کا بھی کچھ حق نہیں جو شخص کام کا ارادہ بھی نہ کرے اس کو نہ شرائط و ضوابط بتلائے جائیں گے اور نہ اس کو آداب و اعذار پوچھنے کا حق ہے وجہ یہ ہے کہ وہ تو شرائط و اعذار اس لئے تلاش کرے گا تا کہ امر بالمعروف کرنا نہ پڑے بلکہ کسی طرح اس سے مخلصی اور رہائی مل جائے جب اعذار معلوم ہو جائیں گے تو کوئی نہ کوئی بات تراشے گا کہ مجھ میں یہ عذر موجود ہیں یہ شرطیں مجھ میں نہیں پائی جاتیں ہم کیسے امر بالمعروف کریں اس لئے علماء کو چاہیئے کہ قبل از شروع عمل کسی کو اعذار و شرائط

[1] جھوٹ

بتلایا ہی نہ کریں جیسے کوئی شخص نماز کا ارادہ ہی نہ رکھتا ہو اور علماء سے پوچھتا ہے کہ نماز کے شرائط و اعذار نہ بتانا چاہیئے ورنہ وہ تو مسقط صلوٰۃ کو ہر حالت میں تلاش کرے گا۔ ہر وقت اسی دھن میں رہے گا کہ کوئی بات ایسی ہو جس سے نماز پڑھنے سے چھٹی مل جائے۔ البتہ جس کا ارادہ ہو پڑھنے کا وہ پوچھے تو اس کو بیشک بتلا دیا جاوے لیکن اگر یہ معلوم ہو جائے کہ محض مخلصی کا متلاشی ہے تو مفتی کو چاہیئے کہ ایسے شخص کو ہرگز جواب نہ دے بلکہ میرے نزدیک ایسوں کو اعذار و موانع کی اطلاع کرنا جائز بھی نہ ہوگا۔

(آداب التبلیغ ص۲)

(۱۰۰) حضرت منصور رحمۃ اللہ علیہ کے انا الحق کہنے کا راز۔

وہ انا الحق خود نہ کہہ رہے تھے بلکہ اس وقت ان کی وہ حالت تھی جیسے شجرہ موسیٰ سے آواز آئی تھی۔ اِنِّیْ اَنَا اللّٰہُ رَبُّ الْعَالَمِیْنَ گو آواز شجرہ ہی سے نکل رہی تھی چنانچہ خود نص میں تصریح ہے نُوْدِیَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَیْمَنِ فِی الْبُقْعَۃِ الْمُبَارَکَۃِ مِنَ الشَّجَرَۃِ اَنْ یّٰمُوْسٰی۔ تو کیا شجرہ خود کہہ رہا تھا۔ انی انا اللہ، ہرگز نہیں ورنہ شجرہ کا رب ہونا لازم آئے گا اور یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ آواز شجرہ میں سے نہیں نکلی تھی بعینہ صوت حق تھی کیونکہ حق تعالیٰ صوت سے پاک ہیں اور یقیناً موسیٰ علیہ السلام کو صوت ہی مسموع ہوئی تھی جو سمت خاص اور مکان خاص کے ساتھ مقید تھی۔ تو اس کو حق تعالیٰ نے وادیٔ ایمن اور بقعہ مبارکہ اور من الشجرہ کے ساتھ مقید کیا ہے ورنہ کلام حق بعینہ ہوتا تو ان قیود سے مقید نہ ہوتا۔ پس ماننا پڑے گا کہ وہ آواز تو شجرہ ہی کی تھی اور اسی میں سے نکلی تھی مگر وہ حق تعالیٰ کی طرف سے متکلم تھا خود متکلم نہ تھا۔ جیسے قرآن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہے فَاِذَا قَرَاْنٰہُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَہٗ کہ جب ہم قرآن پڑھا کریں تو آپ قرأت کا اتباع کیجئے۔ یقیناً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی صورت کو سنتے تھے۔ اور خدائے تعالیٰ صوت سے منزہ ہیں پھر اس قرأنا کا کیا مطلب ہے یہی کہا جاتا ہے کہ یہاں قرأت جبرئیل کو قرأت حق کہا گیا ہے کیونکہ وہ بحکم حق قرأت کرتے تھے ایسے ہی

یہاں بھی قول شجرہ کو قول حق کہا جاتا ہے کیونکہ اس نے جو کچھ کہا تھا بحکم حق کہا تھا پس یونہی منصور کے انا الحق کو خدا تعالیٰ کا قول کہنا چاہیئے کیونکہ غلبۂ حال میں کلام حق ان کی زبان سے نکلا تھا وہ بھی متکلم بحکم حق تھے خود متکلم نہ تھے۔

ایک بزرگ کا واقعہ چنانچہ ایک بزرگ کے واقعہ سے اس کی تائید ہوتی ہے وہ یہ کہ ایک بزرگ نے حق تعالیٰ سے سوال کیا کہ منصور نے بھی اپنے خدا کو خدا کہا تھا اور فرعون نے بھی۔ وہ تو مقبول ہوگئے اور یہ مردود ہوگیا۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ جواب ارشاد ہوا کہ منصور نے اپنے کو مٹا کر انا الحق کہا تھا اور فرعون نے ہم کو مٹا کر انا ربکم الاعلیٰ کہا تھا اس کا یہی مطلب ہے کہ منصور نے جو کچھ کہا تھا خود نہ کہا تھا کیونکہ وہ خود ہی کو مٹا چکے تھے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

گفت فرعونے انا الحق گشت پست　　گفت منصورے انا الحق گشت مست

لعنت اللہ آں انا را در قفا　　رحمۃ اللہ ایں انا را در وفا۔

(المودۃ الرحمانیہ صنہ۳)
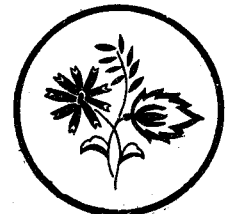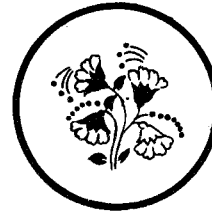
وقار علی ابن مختار علی۔

مالک مکتبہ تھانوی دیوبند سہارنپور۔

فہرست مضامین حصہ سوم

حصہ سوم ختم شد

آسمان کے وجود پر دلیل

اہل سائنس کا دعویٰ ہے کہ آسمان کا وجود نہیں، ستارے سب فضا میں گھوم رہے ہیں، تو دیکھو یہ مسئلہ ظنی ہے یا یقینی، تو سائنس کی رو سے عدم[1] قطعی طور سے ثابت نہیں ہو سکتا۔ آج تک جتنی دلیلیں نفی آسمان[2] پر قائم کی گئیں ان سب کا خلاصہ عدم العلم[3] ہے۔ جو کہ عدم وجود کو مستلزم نہیں اور وجود آسمان دلیل قطعی سے ثابت ہے کیونکہ وجود آسمان فی نفسہٖ ممکن ہے یعنی آسمان کا وجود و عدم دونوں عقلا برابر ہیں اور یہ عقلی مقدمہ ہے کہ جس ممکن کے وجود کی خبر کوئی مُخبر[4] جو قطعاً صادق ہو، دیتا ہو تو اس ممکن کا وجود ثابت قطعی ہوتا ہے۔ اور اس کے وجود کی خبر ایک مخبر صادق یعنی قرآن شریف نے دی ہے۔ پس ان تینوں مقدموں سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہوگئی کہ آسمان موجود ہے۔ اور آسمان کے ممکن الوجود ہونے کی بنا پر میں کہتا ہوں کہ جب یہ عقلاً ممکن ہے یعنی نہ واجب ہے اور نہ ممتنع، پس نہ ضروری الوجود ہوا نہ ضروری العدم تو عقل اس کے وجود یا عدم کی بابت کوئی فیصلہ کر ہی نہیں سکتی۔ زیادہ سے زیادہ اگر کہا جا سکتا ہے تو صرف اس قدر کہ ہم کو از روئے عقل وجود کا پتہ نہیں چلا اور معلوم ہے کہ عدم ثبوت اور ثبوت العدم میں زمین اور آسمان کا فرق ہے امریکہ کا وجود جس وقت تک ہم لوگوں کو ثابت نہ تھا اس وقت تک بھی ہم یوں نہیں کہہ سکتے تھے کہ امریکہ موجود نہیں ہے۔ البتہ یہ کہا جا سکتا تھا کہ ہم کو وجود امریکہ کا علم نہیں ہے۔ پس اہل سائنس یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم کو آسمان کے وجود کا پتہ نہیں چلتا اور یہ ہم کو مضر نہیں کیونکہ ہم تقریر سابق سے ان کو وجود آسمان تسلیم کرا دیں گے۔ البتہ اس کے ضروری الوجود نہ ہونے پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ اہل یونان نے وجود آسمان پر عقلی دلائل قائم کئے ہیں۔

---

[1] نہ ہونا [2] آسمان کے نہ ہونے [3] علم کا نہ ہونا [4] خبر دینے والا

فلاسفہ کے دلائل مخدوش

اس کا جواب یہ ہے کہ فلاسفۂ یونان کے دلائل قریب قریب سب مخدوش ہیں جیسا کہ اہل علم پر مخفی نہیں، واقعیت یہی ہے کہ عقل سے نہ آسمان کا وجود ثابت ہوتا ہے نہ عدم، رہی یہ بات کہ علی العموم اس نیلگوں رنگ کو جو جانب فوق میں نظر آتا ہے آسمان سمجھا جاتا ہے۔ اور آج یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ یہ نیلگوں رنگ آسمان نہیں ہے۔

اس کے جواب میں میں کہتا ہوں کہ اول تو جن دلائل سے یہ ثابت ہوا ہے۔ وہ خود ابھی مخدوش ہیں اور بنار الفاسد علی الفاسد ہے۔ دوسرے اگر ثابت ہو بھی جائے کہ یہ رنگ آسمان نہیں ہے تب بھی اس سے عدم وجود آسمان نہیں ثابت ہوتا۔ ممکن ہے کہ آسمان اس سے آگے ہو۔

شریعت سے سائنس متصادم نہیں

پس یہ کہنا کہ آسمان کا وجود جو کہ شریعت سے ثابت ہے دلائل سائنس سے متصادم ہے سخت غلطی ہے کیونکہ سائنس اس میں بالکل ساکت ہے اور قرآن شریف ناطق، اور تصادم و تعارض ناطقین میں ہوتا ہے۔ ساکت و ناطق میں نہیں ہوسکتا۔ اور جب تعارض نہیں ہے تو سمار کی تفسیر کواکب یا ما فوقنا وغیرہ کرنے کی ضرورت نہیں اور یہ تفسیر یقیناً تحریف ہوگی۔ اور ایسے محرفین کی بابت یہ کہنا صحیح ہے کہ انھوں نے وحی کو معیار نہیں بنایا کیونکہ باوجود وحی کو ماننے کے اس کی حقیقت سمجھنے میں غلطی کی۔

(تقویم الزیغ ص۱۱)

(۲) جدید تعلیم یافتہ کا اسباب علم کو مؤثر حقیقی سمجھنا صحیح نہیں

جواب[۱]:۔ فرمایا، نئے خیال کے لوگ اسباب علم پر ایسے جمع ہیں کہ مسبب الاسباب کو چھوڑ ہی دیا۔ اسباب طبعیہ کے آثار کو لازم سمجھ کر تصرفاتِ حق تعالیٰ کے منکر ہوگئے اور غلطی ان کی یہ ہوئی کہ کسی اثر کے دوام سے اس کا ضروری ہونا اعتقاد کرلیا مثلاً آگ کا اثر ہے جلانا۔ اس کے دوام سے یہ سمجھنا کہ یہ اس کا ذاتی اثر ہے انفکاک[۱] متصور نہیں اور یہ سخت غلطی ہے۔ اسی وجہ سے انھوں نے قصّہ ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسّلام کے متعلق آیت قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَّسَلَامًا۔ میں تاویلاتِ بعیدہ کیں یہ سمجھ کر کہ آگ کیونکر ٹھنڈی ہوسکتی ہے۔

ایک مثال

اس غلطی کی ایسی مثال ہے کہ ریل والوں کی اصطلاح میں گاڑی روکنے کے لئے سُرخ جھنڈی ہوتی ہے ایک نادان بار بار اس کو دیکھ کر یہ سمجھنے لگے کہ خود اس جھنڈی میں یہ اثر ہے کہ اس سے گاڑی رُک جاتی ہے کیونکہ جب دیکھا تو ایسا ہی نظر آیا۔ اور جو لوگ حقیقت جانتے ہیں وہ کہیں گے کہ روکنے والا اصل میں ڈرائیور ہے باقی یہ جھنڈی محض علامت ہے اس میں کوئی اثر ذاتی نہیں۔ ایسے ہی بغیر حکمِ حق ایک ذرہ بھی حرکت نہیں کرسکتا۔ حتیٰ کہ زبان سے جو جو الفاظ نکلتے ہیں ہر ہر حرف پر حکم جدید ہوتا ہے تو زبان حرکت کرتی ہے تمام عالم میں ایسا ہی تصرف جاری ہے۔ افسوس منکرین[۲] نے دوام سے ضروری ہونا اعتقاد کرلیا اور تصرف حق کے منکر ہوگئے۔

(ملفوظ نمبر ۲۵ دعوات عبدیت حصہ (۲))

---

[۱] جدا ہونا [۲] انکار کرنے والے۔

مؤثر حقیقی اللہ تعالیٰ ہے

بعض لوگ ایسے گھڑنے والے ہیں جو مشیت حق ہی کے معتقد نہیں۔ بلکہ اسباب پر ہی ہر چیز کا مدار رکھتے ہیں حالانکہ حق تعالے نے تعطیل اسباب فی بعض الاوقات کو جا بجا ظاہر فرمایا ہے۔ اور اگر اسباب کی حقیقت پر غور کیا جائے تو عقلاً بھی خدا تعالیٰ کی مشیت کو مؤثر ماننا ضروری ہے۔ کیونکہ میں کہتا ہوں کہ جس حادث کے لئے آپ نے ایک دوسری شئی کو سبب مانا ہو وہ سبب بھی تو ایک حادث ہے اس کے لئے کون سبب ہوا۔ اگر اس کے لئے آپ نے تیسری چیز کو سبب بنایا ہم اس میں بھی کلام کریں گے تو اس سلسلۂ ممکنات کو لامحالہ واجب پر منتہی کیا جائے گا ورنہ تسلسل لازم آئے گا اور لامتناہی کے ابطال پر متکلمین دلائل قائم کر چکے ہیں۔ اور یہ حکماء کی حماقت ہے کہ وہ اجزاء عالم کو حادث بالشخص اور قدیم بالنوع کہتے ہیں کہ ہر ہر فرد تو حادث ہے مگر نوع قدیم ہے حالانکہ وہ خود اس کے بھی قائل ہیں کہ نوع کا وجود بدون شخص کے نہیں ہو سکتا۔ پھر جب ہر ہر شخص حادث ہے تو نوع قدیم کا تحقق کیسے ہوگا۔ غرض دلائل عقلیہ سے بھی اور نقلیہ سے بھی مشیت حق کا مؤثر اصلی ہونا ہر طرح ثابت ہے۔ اور جو شخص ہر بات میں لا تسلیم ہی کا سبق پڑھے اس کا علاج متکلمین نے احراق بالنار بتلایا ہے۔ نیز فطرۃً حق تعالیٰ کی ہستی اور قدرت ماننے کی چیز ہے۔ اور ماننے کی چیز کو نہ ماننا تحکم ہے اور تحکم کا تو کوئی بھی جواب نہیں۔

پاگل کا دعویٰ

جیسے ایک مجنون پاخانہ کھا رہا تھا کسی نے ملامت کی۔ تو کہا اس میں حرج ہی کیا ہے یہ وہی تو ہے جو تھوڑی دیر پہلے ہم نے داخل کیا تھا اب وہ ہمارے اندر سے نکل کر برا کیوں ہو گیا۔ ذرا عقلاء کسی عقلی دلیل سے اس کا جواب دیں مگر عرف اور طبیعت سے کام نہ لیں محض عقلی دلیل سے اس کے دعوے کو باطل کریں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اس کے ابطال پر وہ کوئی دلیل قائم نہ کر سکیں گے۔ مگر کیا اس سے کوئی یہ کہے گا کہ اس مجنون کی بات صحیح ہے؟ ہرگز نہیں، سب یوں ہی کہیں گے کہ وہ نالائق پاگل ہے جو نہ ماننے کی چیز کو بھی نہیں مانتا جو اجماعاً ماننے کی چیز ہے۔

خدا کا منکر بھی پاگل ہے

اسی طرح ہم منکر صانع[1] کو پاگل سمجھتے ہیں کیونکہ وہ بھی ایسی ماننے کی چیز کو نہیں مانتا جس کے

---

[1] خدا کا انکار کرنے والا۔

ماننے پر اجماع عقلاء و اتفاق مذاہب ہے اور ضرورتِ فطرت اس پر مزید، یہ تو کامل درجے کی دہریت ہے کہ خدا ہی کو نہ مانے اور ایک قسم کی دہریت یہ بھی ہے کہ خدا تعالیٰ کو تو مانے اور اس کی قدرت و مشیت کو کامل نہ مانے بلکہ یہ پہلی قسم سے بھی بدتر ہے کیونکہ یہ شخص خدا کا قائل ہے اور محض برائے نام قائل ہے۔ جیسے کوئی یوں کہے کہ فلاں بادشاہ تو ہے مگر پنشن یافتہ ہے کہ اسے اختیارات کچھ نہیں۔ چنانچہ بعض لوگ خدا تعالیٰ کو ایسا قادر مانتے ہیں جیسے گھڑی کا کوک دینے والا کہ کوک بھر دینے کے بعد گھڑی کے چلنے میں اس کے اختیار کو کچھ دخل نہیں بلکہ اب وہ خود بخود چلتی رہے گی چاہے کوک دینے والا زندہ ہو یا نہ ہو جب تک کوک بھری ہوئی ہے اس وقت تک گھڑی کو اس کی کچھ ضرورت نہیں۔ ایسے ہی یہ لوگ کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ کا کام اتنا ہے کہ اسباب کو پیدا کر دیا اب اسباب سے مسببات اور علل سے معلولات کا وجود خود بخود ہوتا رہے گا۔ نعوذ باللہ اس تاثر و تاثیر میں حق تعالیٰ کا کچھ بھی اختیار نہیں وہ اسباب سے مسبب کو مختلف نہیں کر سکتے۔ بس ان لوگوں کا خدا کو ماننا ایسا ہے جیسے بعض لوگ۔ من تشبہ بقومٍ فہو منہم۔ سے بچنے کیلئے کوٹ پتلون اور بوٹ سوٹ کے ساتھ ترکی ٹوپی پہنتے ہیں کہ ساری ہیئت کو کفار کی سی ہے صرف ٹوپی سے آپ مسلمان معلوم ہوتے ہیں۔ ایسے ہی یہ لوگ حق تعالیٰ کے لئے قدرت و اختیار تو ایسا ضعیف مانتے ہیں جیسا کہ دہری منکر صانع مانتا ہے کیونکہ جیسا اختیار یہ مان رہے ہیں وہ بھی نہ ماننے کے مثل ہے مگر الزام دہریت سے بچنے کیلئے برائے نام یوں کہتے ہیں کہ خدا موجود ہے۔ اور بعض لوگ خدا تعالیٰ کو بھی مانتے ہیں اور انکی قدرت و اختیار کو کامل بھی مانتے ہیں جیسے عامہ مسلمین۔

مسلمانوں کی حالت

مگر سچ یہ ہے کہ یہ بھی محض زبان ہی سے خدا تعالیٰ کی قدرت کو کامل کہتے ہیں دل سے یہ بھی کامل نہیں مانتے چنانچہ مصائب و حوادث میں ہم اپنے قلب میں وہی ضعف پاتے ہیں جو قائل دہریت کے قلب میں ہوتا ہے ہم نے مانا کہ طبیعت کا بھی ایک اقتضاء ہوتا ہے مگر پھر بھی طبیعت کے اقتضاء میں اعتقاد کی وجہ سے کچھ تو فرق ہونا چاہئے۔ جیسے گرم پانی جو بہت گرم ہو جس کی حرارت ناگوار ہو اس میں ٹھنڈا پانی مل جانے سے کچھ تو فرق ضرور ہوتا ہے اب حرارت ناگوار نہیں ہوتی اسی طرح اعتقاد قدرت الٰہیہ کی برودت سے طبعی خلجان میں کچھ تو کمی ہونا چاہئے۔ ہاں اگر کوئی یہ کہے کہ فرق تو ہے مگر چونکہ ہمارا اقرار ضعیف ہے اس لئے اس فرق کا ظہور نہیں ہوا جیسے گرم پانی کے ایک مٹکے میں لوٹا بھر ٹھنڈا پانی ملا جائے تو پہلے سے گرمی میں کمی تو ضرور ہوگی مگر اس کا احساس بھی نہ ہوگا۔ میں تو کہتا ہوں کہ

جو شئے اپنے اثر سے خالی ہو وہ معتبر نہیں جس چیز پر غایت مرتب نہ ہو وہ غیر معتد بہ ہے۔ اسلئے یہ اعتقاد جس کا اثر کچھ بھی ظاہر نہیں ہوتا معتد بہ نہیں دنیا میں تو اس سے کچھ نفع نہیں ہوگا گو آخرت میں کسی مدت کے بعد کام آجاوے۔ (خیر الحیات وخیر الممات ص۵)

(۳) کثرتِ رائے کلیۃً حق ہونیکی دلیل نہیں

جواب(۱):- آج کل یہ عجیب مسئلہ نکلا ہے کہ جس طرف کثرتِ رائے ہو وہ بات حق ہوتی ہے صاحبو! یہ ایک حد تک صحیح ہے مگر یہ بھی معلوم ہے کہ رائے سے کس کی رائے مراد ہے۔ کیا ان عوام کالانعام کی؟ اگر انھیں کی رائے مراد ہے تو کیا وجہ ہے کہ حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کی رائے پر عمل نہیں کیا۔ ساری قوم ایک طرف رہی اور ہود علیہ السلام ایک طرف۔ آخر انھوں نے توحید کو چھوڑ کر کیوں بت پرستی اختیار نہ کی، کیوں تفریق قوم کا الزام سر لیا۔ اسی لئے کہ وہ قوم جاہل تھی اس کی رائے جاہلانہ تھی۔ آج کل علماء پر یہی الزام لگایا جاتا ہے کہ انھوں نے قوم میں پھوٹ ڈالدی یہ اتفاق نہیں ہونے دیتے۔ (فضائل العلم والخشیۃ ص۳۰)

جواب(۲):- (غزوۂ احد میں) ان پچاس آدمیوں میں (جو پہاڑ کی گھاٹی پر متعین کر دیئے گئے تھے) اختلاف ہوا۔ بعض نے کہا کہ ہمارے بھائیوں کو فتح حاصل ہوگئی ہے اب ہم کو گھاٹی پر رہنے کی ضرورت نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس غرض کیلئے ہم کو یہاں متعین کیا تھا وہ غرض حاصل ہوچکی اسلئے حکم قرار بھی ختم ہوگیا۔ اب یہاں سے ہٹنے میں حضورؐ کے مقصود کی مخالفت نہ ہوگی اور ہم نے اب تک جنگ میں کچھ حصہ نہیں لیا تو کچھ ہم کو بھی کرنا چاہیئے ہمارے بھائی کفار کا تعاقب کر رہے ہیں ہم کو مال غنیمت جمع کر لینا چاہیئے۔ بعض نے اس رائے کی مخالفت کی اور کہا حضورؐ نے صاف فرما دیا تھا کہ بدوں میری اجازت کے یہاں سے نہ ہٹنا۔ اسلئے ہم کو بدوں آپ کی اجازت کے ہرگز نہ ہٹنا چاہیئے۔

مگر پہلی رائے والوں نے نہ مانا اور چالیس آدمی گھاٹی سے ہٹ کر مال غنیمت جمع کرنے میں مشغول ہوگئے۔ یہ ان سے اجتہادی غلطی ہوئی اور گھاٹی پر صرف دس آدمی اور ایک افسران کے رہ گئے۔

(اس واقعہ میں کثرتِ رائے غلطی پر تھی اور قلتِ رائے صواب پر تھی)

جو لوگ کثرتِ رائے کو علامت حق سمجھتے ہیں وہ اس سے سبق حاصل کریں۔ (ذم النسیان ص۱۲)

صرف کثرتِ رائے کی کوئی حقیقت نہیں

جواب(۳) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد کچھ قبائل مرتد ہوگئے تھے جن میں بعض تو مسیلمہ کذاب وغیرہ مدعیان نبوت کے ساتھ ہوگئے تھے۔ اور بعض لوگ کسی کے ساتھ تو نہیں ہوئے بلکہ ظاہر میں اپنے کو مسلمان کہتے رہے۔ توحید ورسالت کے مقر رہے۔ کعبہ کو قبلہ مانتے رہے۔ نماز کی فرضیت کے قائل رہے۔ مگر زکوٰۃ کی فرضیت سے منکر ہوگئے اور یہ کہا کہ فرضیتِ زکوٰۃ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے مخصوص تھی، اب فرض نہیں اور علت یہ بتلائی کہ حضورؐ کے زمانے میں مسلمانوں پر فقر زیادہ تھا۔ اسلئے اس وقت زکوٰۃ کی ضرورت تھی۔ اب وہ حالت نہیں رہی اسلئے فرضیت بھی باقی نہیں رہی۔ جیسے آجکل بھی بہت سے لوگ اس قسم کی تاویلیں کیا کرتے ہیں۔

پہلی جماعت کے بارہ میں سب صحابہ کی بالاتفاق یہ رائے تھی کہ ان کے ساتھ جہاد کیا جائے مگر دوسری جماعت کے حق میں سب کی رائے نرم تھی۔ حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بھی یہ رائے تھی کہ ان کے ساتھ نرمی کیجائے اور جو کھلے کافر ہیں صرف ان سے لڑائی کیجائے۔ ان لوگوں پر جہاد نہ کیا جائے۔

صدیق اکبرؓ کی عزیمت

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی رائے اس دوسری جماعت کے متعلق بھی وہی تھی جو اور مرتدین کے متعلق تھی وہ ان لوگوں کو کافر کہتے تھے اور یہ فرماتے تھے کہ جو شخص نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا میں اسکے ساتھ قتال کروں گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ یہ لوگ تو لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہتے ہیں۔ ہمارے قبلہ کی طرف نماز پڑھتے ہیں ان پر کیونکر جہاد ہوسکتا ہے۔ اور ان کو کفار کی طرح کیسے قتل کیا جاسکتا ہے۔ حضرت صدیقؓ نے فرمایا کہ یہ سب کچھ سہی مگر یہ لوگ نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرتے ہیں کہ نماز تو فرض مانتے ہیں اور زکوۃ کو فرض نہیں مانتے حالانکہ شریعت نے دونوں کو فرض کیا ہے تو یہ لوگ فرض قطعی کے منکر ہیں اور ان لوگوں نے دین کو بدل دیا ہے اور حضورؐ کا ارشاد ہے من بدل دینہٗ فاقتلوا، اس لئے میں انکے ساتھ قتال کروں گا۔

حضرت عمرؓ کو جواب دیا

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پھر کہا کہ آپ کلمہ گو آدمیوں سے کیسے قتال کریں گے؟ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا اجبار فی الجاهلية خوار فی الاسلام، واللہ لو منعونی عقالاً وفی روایة عناقا کانوا یودونہ الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لاقاتلتہم علیہ۔

ترجمہ:۔ اے عمر! یہ کیا کہ تم جاہلیت میں تو زبردست تھے اور اسلام میں اتنے بودے ہوگئے۔ بخدا اگر یہ لوگ ایک رسی کو یا بکری کے بچہ کو بھی روکیں گے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا کرتے تھے تو میں اس پر بھی ان سے قتال کروں گا۔

اور یہ بھی فرمایا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس وقت میں بھی تھا۔ تو خدا تعالیٰ میرے ساتھ بھی ہیں اگر میں تنہا بھی جہاد کو نکل کھڑا ہوں گا تو خدا تعالیٰ میرے ساتھ ہیں ان شاء اللہ میں تمام دنیا پر غالب آؤں گا۔ کیا انتہا ہے اس قوتِ قلب کی۔

چنانچہ پھر سب صحابہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی رائے پر متفق ہوگئے۔ اس واقعہ سے بھی ان لوگوں کو سبق حاصل کرنا چاہئے جو کثرت رائے کو علامتِ حق سمجھے ہوئے ہیں۔

(ذم النسیان صـ۳)

(۴) مکہ معظمہ میں ہزاروں جانوروں کا ذبح ہوجانا کیا خلافِ عقل ہے؟

جواب اس کا یہ ہے کہ جناب من ہے تو خشک بات لیکن تفہیم کے لئے عرض ہے کہ اگر تمہاری عقل میں کسی شے کا نہ آنا خلاف عقل ہونے کی دلیل ہے تو ہمارا آپ کا پیدا ہونا جس طریقہ سے ہے وہ بھی عقل کے خلاف ہے اور اس کا امتحان یہ ہے کہ ایک بچہ ایسا تجویز کیا جائے کہ وہ تہہ خانے میں پرورش کیا جائے اور اس کے سامنے کبھی اس کا تذکرہ نہ کیا جائے کہ آدمی

کس طرح پیدا ہوتا ہے حتیٰ کہ جب بیس برس کا ہوجائے تو اس سے دفعۃً کہا جائے کہ آدمی اس طور سے پیدا ہوتا ہے تو ہرگز اس کی عقل میں نہ آئے گا اور ہم چونکہ رات دن دیکھتے ہیں سنتے ہیں کہ اس طریقہ سے انسان پیدا ہوتا ہے اس لئے ہم کو خلافِ عقل نہیں معلوم ہوتا۔

تو جناب ہم تو جب سے پیدا ہوئے ہیں ہمارے تمام حالات ہی خلافِ عقل ہیں۔ ہماری عقل تو بس کھانے کمانے کی ہے۔ ایسے ہی جیسے کسی بھوکے سے پوچھا تھا کہ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں کہا چار روٹیاں ایسے ہی ہماری عقل صرف اس قدر ہے کہ کھالو اور پی لو، اور باتیں بنالو۔ جب اتنی عقل ہے تو اسرارِ شریعت کہاں تک سمجھ میں آئیں۔

ایسے ہی نفس اضحیہ بلا تقسیم لحم کے بھی حکمت ہے۔ اگر ہماری عقل میں نہ آئے تو قابلِ انکار کیسے ہوگی۔ اور اس لئے ہمارے ذمہ ضروری نہیں ہے کہ اس حکمت دراز کو بیان کریں لیکن تبرعاً بتائے دیتے ہیں۔

قربانی کی حقیقت

وہ یہ ہے کہ اصل میں یہ سنتِ ابراہیمی کا اتباع ہے۔ اور شئے محبوب کا انفاق مقصود ہے اور وہ صرف جانور ذبح کر دینے سے حاصل ہوجاتا ہے۔ گوشت خواہ رکھیں یا تقسیم کریں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اصل عمل تو یہ تھا کہ بیٹے کو ذبح کریں لیکن اول تو سب کے بیٹا ہوتا نہیں۔ دوسرے یہ کہ اگر یہ حکم ہوتا تو بہت کم ایسے نکلتے جو یہ عمل کرتے۔ یہ حق تعالیٰ کا فضل ہے کہ جانور کو قائم مقام ذبح ولد کے کردیا۔ اس لئے یہ کہنا کہ قربانی میں مال ضائع کرنا ہے جیسے آجکل نو تعلیم یافتہ اصحاب کا خیال ہے سرتا سر غلط ہے اور قربانی کا مقصود اظہار محبت ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور وہ اس میں حاصل ہے پھر مال کہاں ضائع ہوا۔ (ترغیب الاضحیہ صـ۱۲)

(۵) جماعت علماء کو نکما سمجھنا صحیح نہیں

برسبیل وعظ بیان فرمایا کہ آج کل لوگوں نے علماء کی جماعت کو کم ہمت بیکار ردّی پلٹن اور کیا کیا خطاب دے رکھے ہیں۔ حالانکہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ عربی پڑھنے سے دماغ میں ایک خاص انجلاء ہوجاتا ہے۔ فرض کیجئے اگر دو شخص یکساں دماغ کے انگریزی پڑھیں اور ایک ان میں عربی بھی پڑھا ہوا ہو صرف انگریزی پڑھے ہوئے سے تقریر و تحریر و فہم میں

مقابلۃً ضرور زیادہ ہوگا۔ چنانچہ ایک جج عربی پڑھے ہوئے تھے ان کے فیصلے نہایت مدلل اور پرزور ہوتے تھے ہم لوگ عربی پڑھے ہوئے اگر دنیا کمانے پر آئیں تو آپ لوگوں سے اچھی کما دکھائیں۔

تو فہم کے متعلق تو یہ گفتگو تھی۔ رہی کم ہمتی، اس کا شبہ اس سے ہوتا ہے کہ یہ لوگ بہت روپے نہیں کماتے قلیل پر قناعت کرتے ہیں تو اس کا جواب ایک سے سمجھ لیجئے۔

اگر کوئی شخص آپ کے یہاں نوکر ہو اور صرف پانچ روپے ماہوار پاتا ہو اور کوئی دوسرا شخص اس کو بیس روپے دینے لگے لیکن وہ یہ کہدے کہ مجھ کو تو یہ پانچ روپے ہی اچھے ہیں آپ اپنے آقا کو نہ چھوڑوں گا تو سچ کہئے کیا آپ اس کو کم ہمت اور بیکار کا خطاب دیں گے؟ نہیں بلکہ آپ اسکو کہیں گے کہ بڑا عالی ہمت اور وفادار شخص ہے کہ بیس روپیہ پر لات مار دی اور اپنے آقا کو نہ چھوڑا۔ اور اس کے پانچ ہی روپیوں پر قناعت کی۔ پھر تعجب ہے کہ ان لوگوں کو جو علم دین کی خدمت میں رہتے ہیں کیونکہ کم ہمت اور بیکاروں کی پلٹن وغیرہ کے خطاب ملتے ہیں حالانکہ جیسا اوپر کہا گیا اگر یہ مولوی لوگ دنیا کمانے پر آجائیں تو آپ لوگوں سے اچھی کما دکھائیں لیکن پھر باوجود قدرت کے دنیاوی منافع کو چھوڑ کر دین کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں اور روکھے سوکھے ٹکڑوں میں خوش ہیں تو انکو کیوں عالی ہمت اور وفادار اپنے آقا یعنی خداوند کریم کا نہیں کہا جاتا۔ آپ لوگ جو خدمت علماء اور اہل دین کی کرتے ہیں۔ یہ نہ سمجھئے کہ ہمارا احسان ہے۔ آپ تو محض خزانچی ہیں اور خزانچی جو بڑے بڑے عہدہ داروں اور اہل کاروں کی تنخواہیں تقسیم کرتے ہیں یہ ان کا کوئی احسان نہیں ہے بلکہ خزانہ سرکاری ہے۔ خزانچی تو ایک چھوٹی سی تنخواہ کا ملازم ہے اس کے سپرد ہی یہ خدمت ہے اللہ تعالیٰ اپنا حکم بھیجتا ہے اور گردن دبا کر آپ کے ذریعہ سے ان بزرگوں کو اپنا عطیہ پہونچاتا ہے آپ کا کوئی احسان نہیں۔ (ملفوظ نمبر ۱۴۔ دعوات عبدیت حصہ سوم)

(۶) حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سے دیکھنے پر شبہہ کا جواب

فرمایا۔ آئینہ میں صورت جب تک نظر آتی ہے جب تک کہ آنکھ کسی دیکھنے والے کی کھلی ہوئی ہو۔ کیونکہ نظر آنے کی حقیقت یہ ہے کہ شعاع آنکھ سے نکل کر آئینہ پر پڑکر پھر رائی کی

طرف لوٹتی ہے اسلئے صورت نظر پڑتی ہے جب نگاہ نہ کی تو شعاع نہ نکلی۔ تو پھر نظر آنے کا کوئی سبب نہیں۔ غرض آئینہ میں جو نظر آتا ہے وہ کوئی مبائن چیز نہیں بلکہ اس چہرہ پر نگاہ لوٹ کر پڑتی ہے جب مرئی سے اپنی شعاعوں کا تعلق علت ہے رویت کی، پس اگر کسی شخص کو یہ قوت حاصل ہو کہ سیدھی شعاعوں کو مقوس کر سکے تو اس کو پیچھے سے بھی مثل سامنے کے نظر آئے گا۔ چنانچہ صوفیہ کے بعض اشغال میں سر نظر آنے لگتا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیچھے سے بھی دیکھتے تھے۔ اور اس کی وجہ میں بعض علماء کہتے ہیں کہ آپ کے سر میں پیچھے کی جانب دو سوراخ تھے ان سے نظر آتا تھا تو اس کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ ممکن ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے شعاعوں کے مقوس بنانے کی قوت مرحمت فرمائی تھی۔ جب آپ قصد فرماتے آگے دیکھ لیتے اور پیچھے کا قصد کرتے تو پیچھے نظر فرما لیتے ہر شخص میں یہ قوت نہیں اسلئے نظر نہیں آتا۔ اور اس توجیہ کو حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ نقل فرماتے ہیں۔ (ملفوظ نمبر ۵۷ ایضاً)

(۷) کافر کو عذاب دائمی ہونے پر شبہہ کا جواب

جواب (۱): برسبیل وعظ فرمایا کہ کافر کو جو ابدی عذاب ہے اس میں کوئی ظلم نہیں کیونکہ کافر اللہ کے ہر ہر صفت کے حقوق ضائع کرتا ہے اور اس کی صفات لامتناہی ہیں اور خود ہر صفت کے حقوق بھی غیر متناہی ہیں تو چاہیے تو یہ تھا کہ ہر صفت کے انکار پر لامتناہی سزا ہوتی اور پھر ہر صفت کے حقوق پر اسی طرح غیر متناہی سزا ہوتی پھر زیادتی کہاں ہوئی۔ بلکہ ایک معنیٰ کر کے کمی ہے۔ بغاوت کی سزا قید دائمی ہی ہوتی ہے جس کا دوام حکام ظاہری کے اختیار میں ہے یعنی تاحیات وہ اپنے باغیوں کے لئے مقرر کرتے ہیں۔ اور جس قسم کا دوام احکم الحاکمین کے اختیار میں ہے یعنی اصلی، وہ اپنے باغیوں کے واسطے تجویز فرمائیں گے اس میں ظلم اور زیادتی کچھ بھی نہیں بلکہ عین عدل ہے۔ (مجادلات معدلت نمبر ۲ حصہ ایضاً)

جواب (۲): سزا مناسب جنایت ہونی چاہیے اور یہاں جنایت متناہی ہے کیونکہ عمر کافر کی متناہی ہے تو سزا بھی متناہی ہونی چاہیے اس کا جواب حصہ اول میں گذر چکا۔

(۸) احکام شریعت کی علتیں دریافت کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ قلب میں عظمت حق نہیں

صاحبو! دین کو لوگوں نے تختۂ مشق بنالیا ہے کہ لوگ اپنی رایوں کا احکام میں دخل دیتے ہیں اور ان کی علتیں گھڑتے ہیں اور علماء سے بھی اس طرح سوال کرتے ہیں کہ امر اس طرح کیوں ہے سود لینا کیوں حرام ہے، فلاں بات کس لئے منع ہے۔ پھر فرمایا کہ میں نے ایک موقعہ پر اس کے متعلق یہ بیان کیا تھا کہ یہ بات تو مسلم ہے کہ اگر کسی مکان میں ماہرین علوم جدیدہ بیٹھے ہوں اور انجنیر صاحب آن کر یوں کہیں کہ فوراً اٹھو، یہ مکان گرا چاہتا ہے تو کچھ بھی تامل اٹھنے میں نہ کریں گے اور علت نہ پوچھی جائے گی اس وجہ سے کہ وہ جانتے ہیں کہ وہ ایسے فن سے واقف ہیں جو ہم نہیں جانتے اسلئے انکے حکم کی قدر کی جاتی ہے اور اس لئے ان کے کہنے کے موافق عمل کرنے میں تامل نہیں کرتے، نہ علت تلاش کرتے ہیں نہ اس سے علت پوچھتے ہیں بلکہ حکم کی تعمیل کے واسطے تیار ہو جاتے ہیں۔ یا سول سرجن صاحب آکر اگر کوئی دوا بتائیں تو اس میں کچھ بھی چون وچرا نہیں کرتے۔ جانتے ہیں کہ یہ اس فن کا ماہر ہے۔ سمجھنے کی بات ہے کہ جس فن سے یہ لوگ واقف نہیں اس میں لم اور کیف سے کس لئے دخل دیتے ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ کسی کی عظمت مانع ہوتی ہے اس کے احکام کی علت ڈھونڈھنے سے۔ اس کی نظیر ایسی سمجھ لیجئے کہ ایک تو کوئی دوست برابر کے مرتبے کا حکم کرے تو اس کی علت پوچھتے ہیں کہ تم نے یہ حکم کس لئے دیا۔ اور ایک حاکم کی طرف سے کوئی حکم صادر ہو تو ہرگز علت نہیں پوچھتے۔ وجہ یہ ہے کہ دوست کی عظمت اتنی قلب میں نہیں۔ ایک معمولی چیز ہے۔ اور احکام کی عظمت ہے اس لئے حجت نہیں کرتے۔ سو جب خدا تعالیٰ کے احکام کی علل دریافت کیجاتی ہے اس سے تو شبہ پڑتا ہے کہ ان کے دل میں حق تعالیٰ کی عظمت نہیں ہے۔ غرض محکوم ہونے کی حیثیت سے علل دریافت کرنا عقلاً بیہودہ امر ہے۔ ہاں طالبِ علمی کی حیثیت سے بغرض تحقیق فن مضائقہ نہیں۔ مگر وہ منصب صرف طالب علموں کا ہے۔ چنانچہ طلبہ اور شاگرد اساتذہ سے بڑی بڑی حجتیں کرتے ہیں۔ سنو! اس کیلئے تعلیم فن کی ضرورت ہے۔ ہمارے پاس اگر ترتیب وار پڑھو۔ پھر اپنے وقت جو امر سمجھنے کا ہے وہ سمجھ لیں اور خود آجائے گا۔ دریافت کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔

خیال تو کیجئے، کلکٹر کا منادی آکر جب حکم سے اطلاع کرتا ہے تو کوئی علت نہیں پوچھتا، افسوس ہے علماء کو بھنگی سے بھی زیادہ ذلیل سمجھنے لگے ہیں۔ علماء در حقیقت منادی کرنے والے اور ناقل احکام ہیں خود موجد احکام نہیں اس لئے ان سے علتیں پوچھنا حماقت نہیں تو کیا ہے۔ پھر جب آپ نے ایک فن سیکھا نہیں اور آپ اس سے محض ناواقف ہیں تو آپ کو سمجھانا بھی تو ایسا ہی ہوگا جیسے ایک سائیس کو اقلیدس کی اشکال سمجھانے لگیں۔ تو وہ کیا سمجھے گا؟ اس کی تدبیر تو یہی ہے کہ پہلے اسکو اقلیدس کے مبادی سمجھا دو۔ جو اشکال کی موقوف علیہ ہیں پھر اشکال سمجھاؤ تو خوب سمجھے گا۔ علماء آجکل اپنے کی وجہ سے لوگوں کی رائے پر چلنے لگے ہیں جس سے عوام کی جرأت بڑھ گئی ہے۔ ایسا نہیں چاہئے۔ علماء کیا نوکر ہیں کہ بے فائدہ دماغ خالی کریں۔

(مجادلات معدلت نمبر ۳ حصہ سوم دعوات عبدیت)

(۱۹) احکام شریعت کو مصالح دنیوی کی بنا قرار دینا خطرناک مسلک ہے۔

اس طرز تقریر میں زہر بھرا ہوا ہے جو اس کو جان لے گا وہ سمجھ جائے گا۔ یہ لوگ ایسے اسرار بیان کر کے اسلام کے ساتھ دوستی نہیں کرتے بلکہ دشمنی کرتے ہیں اور یہ حامیٔ اسلام نہیں بلکہ اسلام کے نادان دوست ہیں۔ ع

"دوستی بے خرد چوں دشمنی ست"

اب میں آپ کو بتلاتا ہوں کہ اس تقریر میں زہر کیا ہے۔ اس میں مضمون کا حاصل یہ ہے کہ بس اصل چیز تو اتفاق ہے اور جماعتِ پنجگانہ اور جمعہ وعیدین وحج اسی اتفاق کے پیدا کرنے کے واسطے ذرائع ووسائل ہیں۔ تو عجب نہیں کہ بعض لوگوں پر اس کا یہ اثر ہو کہ وہ ان احکام کو مقصود بالذات نہ سمجھیں اور اگر کبھی کسی دوسرے طریق سے اتفاق ممکن ہوا تو وہ سب آسانی سے جماعت اور نماز دونوں کے چھوڑنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ کیونکہ ان کے خیال میں تو یہ سب احکام حصول اتفاق کیلئے مقرر ہوئے ہیں۔ اور انکو کلب جانے اور تھیٹر میں مل کر شریک ہونے سے بھی یہ بات حاصل ہو سکتی جہاں راحت ہے آرام کرسی اور گدّے تکیوں پر جگہ ملتی ہے تو وہ خواہ مخواہ

مسجد میں کیوں آنے لگے اور وضو اور نماز کی مشقت کیوں برداشت کرنے لگے۔

وضو کا انکار

چنانچہ اس وقت ان تقریروں کا یہ ضرر نمایاں ہو رہا ہے اخباروں میں ایک شخص کا قول شائع ہوا تھا کہ وضو کی ضرورت ابتدائے اسلام میں تھی آج کل نہیں ہے کیونکہ اس وقت بدوی لوگ پاک صاف نہ رہتے تھے۔ جنگل کے گرد و غبار سے غبار آلودہ آتے تھے اسلئے ان کو وضو کا حکم کیا گیا۔ اور ہم لوگ آج کل ہم لوگ صفائی کا بہت اہتمام رکھتے ہیں ہر وقت موزے اور دستانے چڑھائے رہتے ہیں جن کی وجہ سے ہاتھ پیر گرد سے محفوظ رہتے ہیں ہم کو وضو کی ضرورت نہیں۔

یہ نتیجہ ہے ایسے اسرار بیان کرنے کا کہ اب ہر شخص اس قسم کی مصلحتوں ہی کو مقصود سمجھنے لگا اور اس شخص سے کچھ بھی تعجب نہیں کہ وہ نماز کو بھی چھوڑ دے اور یہ کہے کہ نماز کی ضرورت ابتداءِ اسلام میں اسلئے تھی کہ اس زمانے کے لوگ جاہلیت کی وجہ سے بڑے متکبر و سرکش ہوتے تھے اور ان کو مہذب بنانے کے لئے یہ افعال تواضع و خشوع کے تعلیم فرمائے گئے تھے۔ اور ہم لوگ تعلیم یافتہ ہیں ہمارے اندر تعلیم سے تہذیب پیدا ہو گئی ہے ہم کو نماز کی کیا ضرورت ہے۔

قربانی پر اعتراض

اسی طرح قربانی کے متعلق ایک شخص نے جو کہ مسلمان ہیں انگلستان سے مجھ کو لکھا تھا کہ قربانی شریعت کو مقصود نہیں اور یہ بالکل خلافِ عقل ہے کہ ایک دن میں اتنے جانوروں کو ذبح کیا جاوے جن کا گوشت آدمیوں سے کھایا بھی نہ جائے۔ چنانچہ اس لئے منیٰ میں قربانی کرتے ہی جانوروں کو کھیتوں میں[1] ڈال دیا جاتا ہے۔ غضب یہ ہے کہ آج کل خدا پر بھی عقل کی حکومت ہونے لگی۔ صد افسوس ہے۔

---

[1] ان حضرات نے منیٰ میں کھیتوں کے اندر جانوروں کے دبانے کی جو یہ وجہ بتلائی کہ اتنا گوشت آدمیوں سے کھایا نہیں جاتا یہ بالکل غلط ہے کیونکہ موسم حج پر جتنے آدمی جمع ہوتے ہیں سب کے سب مالدار نہیں ہوتے اور نہ سب قربانی کرتے ہیں بلکہ حجاج میں زیادہ تر غرباء ہوتے ہیں۔ ہم دعویٰ سے کہتے ہیں کہ اگر منیٰ کے قربانی کا سارا گوشت حجاج میں اور بدویوں میں تقسیم کر دیا جائے تو وہ ہرگز سب کو کافی نہ ہوگا بلکہ بہت لوگ پھر بھی محروم رہ جائیں بلکہ منیٰ میں قربانی کے جانوروں کو محض ڈاکٹروں کی رائے سے دبایا جاتا ہے۔

بس اس خلافِ عقل حرکت کے جواب وہ ڈاکٹر ہیں جن کی رائے سے ایسا کیا جاتا ہے۔

قانون عقل پر حاکم ہے

میں کہتا ہوں کہ ایک جج اگر کسی مجرم کو سزا دے اور مجرم یہ کہے کہ یہ سزا تو عقل کے خلاف ہے تو کیا وہ اس بات کی سماعت کرے گا۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ وہ صاف یہ کہے گا کہ قانون پر تمہاری عقل کی حکومت نہیں بلکہ قانون عقل پر حاکم ہے۔ اور اس کے اس جواب کو سب عقلاء تسلیم کرتے ہیں۔ مگر حیرت ہے کہ قانون الٰہی کو آج کل کے مسلمان اپنی عقل پر حاکم نہیں مانتے بلکہ اس کو اپنی عقل کے تابع کرنا چاہتے ہیں اور یہ جواب علیٰ سبیل التنزل ہے۔ ورنہ قانون الٰہی تو بالکل عقل کے مطابق ہے بشرطیکہ عقل سلیم ہو۔ یہ کیا ضرور ہے کہ ہر شخص کی عقل میں اس کی حکمتیں آجایا کریں۔ آخر پارلیمنٹ کے عقلاء جو قوانین تجویز کرتے ہیں کیا ہر عامی کی عقل اس کے مصالح تک پہونچ جاتی ہے؟ ہرگز نہیں! بلکہ اس کے مصالح و حکم کو خاص خاص حکام ہی سمجھتے ہیں۔ پھر قانون الٰہی کی حکمتوں اور مصالح کو ہر شخص اپنی عقل سے کیوں معلوم کرنا چاہتا ہے۔ اور یہاں یہ کیوں نہیں کہا جاتا کہ قانون الٰہی عقل کے مطابق ضرور ہے مگر ہماری عقلیں اس کے مصالح سمجھنے سے قاصر ہیں۔ خاص خاص لوگ ہی اس کو سمجھ سکتے ہیں اور بالفرض اگر کسی قانون کی حکمت خاص لوگوں کی عقل میں بھی نہ آئے تو قانون کے بدلنے کا کسی کو اختیار نہیں کیونکہ قانون پر عقل حاکم نہیں بلکہ اس کی ماتحت اور اس کی تابع ہے۔

قربانی کا مقصد

غرض ان حضرات نے مجھے لکھا کہ قربانی خود شریعت کو مقصود نہیں بلکہ اصل مقصود غرباء کی امداد ہے اور ابتدائے اسلام میں لوگوں کے پاس نقد کم تھا۔ مویشی زیادہ تھے۔ اسلئے یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ جانور ذبح کر کے غرباء کو گوشت دیدو۔ اور اس زمانہ میں نقد بھی بہت موجود ہے۔ غلہ بھی موجود ہے۔ پس آج کل بجائے قربانی کرنے کے نقد روپیہ سے غرباء کی امداد کرنا چاہیئے۔ تو اس شخص نے قربانی کی حکمت امداد غرباء سمجھ کر جب یہ دیکھا کہ یہ حکمت دوسرے طریقہ سے بھی با آسانی حاصل ہو سکتی ہے۔ قربانی چھوڑنے کا ارادہ کر لیا حالانکہ یہ حکمت مقصود ہی نہیں بلکہ مقصود تو تعمیل حکم ہے۔ اگر یہ حکمت مقصود ہوتی تو اسکی کیا وجہ کہ غرباء کو زندہ جانور دینے سے واجب ادا نہیں ہوتا۔ اگر اس زمانے میں نقد اور غلہ کم تھا اور مویشی زیادہ تھے۔ اسلئے جانوروں کے ذریعہ غرباء کی امداد کا طریقہ مقرر ہوا تھا۔ تو اس کے معنیٰ کہ جانور کو ذبح کر کے غرباء کو گوشت ہی دیا جائے تو واجب ادا ہو اور زندہ جانور کسی غریب کو دیدیں تو واجب ادا نہ ہو۔

پھر کیا پہلے مسلمانوں پر نقد کی وسعت کبھی نہ ہوئی تھی؟ بالکل غلط ہے۔ تاریخ اٹھاکر دیکھو تو معلوم ہو کہ صحابہ نے جس وقت کسریٰ وقیصر کے خزانے فتح کئے ہیں تو مسلمانوں کے پاس نقد سونا اور چاندی اس قدر تھا کہ آج کل تو اس کا عشر عشیر بھی نہ ہوگا۔ پھر اس وقت صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہ بات کیوں نہ سوجھی جو اس شخص کو انگلستان میں بیٹھکر سوجھی اور صحابہؓ نے بجائے قربانی کے نقد امداد کو کیوں نہ اختیار کیا۔

دوسرے اگر یہ حکمت قربانی سے مقصود بالذات ہوتی تو اس کا مقتضیٰ یہ تھا کہ قربانی کے گوشت میں سے کسی حصہ کا تصدق ضرور واجب ہوتا حالانکہ شریعت میں یہ بھی حکم نہیں بلکہ اگر کوئی شخص سارا گوشت خود ہی کھالے اور غریبوں کو حبہ برابر بھی نہ دے تو قربانی میں کچھ قصور نہیں آتا۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ امداد غربار قربانی سے مقصود بالذات نہیں بلکہ مقصود کچھ اور ہے۔ مگر آپ نے دیکھ لیا کہ اس قسم کے اسرار بیان کرنے کا نتیجہ کہاں تک پہونچا ہے کہ ہر شخص اپنی مخترع حکمتوں پر احکام سمجھنے لگا۔ (سبیل النجاح صہ۱۵)

(۱۰) کعبہ کا بعض بزرگوں کے استقبال کیلئے جانیکی تحقیق، اور اس پر شبہات کا جواب

بعض بزرگوں کی نسبت یہ مشہور ہے کہ وہ مکہ معظمہ پہونچے تو جاکر دیکھا کہ کعبہ نہیں ہے سخت حیرت ہوئی اور باری تعالیٰ سے دعا کی کہ مجھے معلوم ہوجائے کہ اس وقت کعبہ کہاں ہے چنانچہ ارشاد ہوا کہ ہم منکشف کئے دیتے ہیں۔ دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک بزرگ آرہے ہیں۔ کعبہ ان کے استقبال کو گیا ہوا تھا۔

اور یہ حکایت تین فرقوں کو مضر ہوئی ایک تو ان کو جنہیں دین سے کچھ بھی تعلق اور واسطہ نہیں۔ ایسے لوگوں نے تو اس کی تکذیب کی۔ اور کہنے والوں پر ہنسنا اور وہم پرست کہنا شروع کیا۔ دوسرے ان دینداروں کو جو کہ محض ظاہر پرست ہیں۔ ایسے لوگوں نے انکو صوفیہ کے ڈھکوسلے کہکر اڑا دیا۔ تیسرے ان لوگوں کو جو فلسفی دماغ کے ہیں اور تاریخ ان کا نصب العین ہے۔ انھوں نے

اس کو خلاف عقل بتلایا۔ اور یہ اعتراض اس پر کیا کہ اگر ایسا ہوتا تو تاریخوں میں اس کا تذکرہ ضرور ہوتا۔ سو ہم نے کسی تاریخ میں نہیں دیکھا۔ حالانکہ ان تینوں کی حالت یہ ہے۔ ع

"چوں نہ دیدند حقیقت رہ افسانہ زدند"

تو سمجھو کہ ایک کعبہ کی صورت ہے اور ایک کعبہ کی روح ہے۔ روحِ کعبہ ایک خاص تجلی ہے کہ کعبہ ظاہری اس کا مظہر ہے۔ پس جن بزرگوں نے یہ دیکھا کہ کعبہ اپنی جگہ نہیں ہے اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ روحِ کعبہ زائرین کی طرف متوجہ نہیں ہے بلکہ ان بزرگ کی طرف متوجہ ہے۔

غرض بعض بزرگ ایسے بھی ہوئے ہیں کہ جن کی طرف کعبہ نے خود توجہ کی۔ لیکن حج کیلئے انکو بھی خود کعبہ ہی میں آنا پڑا۔ (اصلاح النفس صہ۱۴)

(۱۱) جدید تعلیم یافتہ طبقہ کی اس غلطی کا جواب کہ اسلام میں سلطنت جمہوری کی تعلیم ہے

نظامِ عالم تابعیت ومتبوعیت کو چاہتا ہے اس لئے متبوع کو تابع کی مساوات گوارا نہیں اسی وجہ سے سلطنت کی ضرورت ہے تاکہ ایک تابع ہو ایک متبوع ہو۔ سب کے سب آزاد نہ ہوں بلکہ متبوع کے سامنے تابع کی آزادی سلب ہوجائے۔ یہ حقیقت ہے سلطنت کی۔ اگر سلطنت نہ ہو تو ہر شخص آزاد ہوگا اور آزادی مطلق انتظام کے لئے ہرگز کافی نہیں۔ اور نہ کسی نے آج تک اسکو گوارا کیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ سلطنت کوئی چیز نہیں۔ چنانچہ آجکل ایک فرقہ نکلا ہے جو سلطنت کا مخالف ہے مگر میں نہیں سمجھتا کہ بدون سلطنت کے انتظام نزاعات کا فیصلہ کیونکر ہوگا۔ اگر کہو کہ کثرتِ رائے سے فیصلہ ہوگا تو میں کہتا ہوں کہ جن کثیرین کی رائے پر فیصلہ ہوگا وہی سلطنت کے مصداق ہوگئے۔ کیونکہ ان کے سامنے دوسروں کی آزادی سلب ہوگئی۔ اور یہی حقیقت ہے سلطنت کی کہ بعض کی آزادی بعض کی رائے کے سامنے سلب ہوجائے۔ کثرتِ رائے پر فیصلہ ہونے کے بعد بھی آزادی مطلق کہاں رہی۔ اس فیصلہ کی پابندی سے بھی تو آزادی سلب ہوگی۔ تو یہ لوگ جس چیز کو مٹاتے ہیں اخیر میں اس کو ثابت کرتے ہیں۔ خدائے تعالیٰ نے بھی آزادی مطلق کو گوارا نہیں کیا بلکہ

ایک کو تابع ایک کو متبوع بنایا ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے اپنے احکام نبی کے واسطے سے بھیجے ہیں اور تمام مخلوق پر نبی کا اتباع فرض کیا ہے تاکہ مخلوق کو کسی ایک کا تابع کیا جائے۔ ورنہ بہت سہل تھا کہ انبیاء علیہم السلام کو نہ بھیجتے بلکہ آسمان سے چھپے ہوئے کاغذ ہر ایک کے پاس آگرا کرتے اور ہر شخص اس کو پڑھ کر کام کرتا نہ نبی کا اتباع ضروری ہوتا، نہ خلیفہ کا نہ علماء کا نہ مجتہدین کا۔

خدا کے یہاں پریس کہاں ہے

شاید کوئی کہے کہ خدا تعالیٰ کے یہاں پریس کہاں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جب ہم نے پریس ایجاد کر لئے ہیں تو خدا تعالیٰ کو پریس بنا لینا کیا مشکل ہے۔ بلکہ تم جو کچھ ایجاد کرتے ہو یہ عقل سے ایجاد کرتے ہو، اور عقل خدا کی دی ہوئی ہے تو یہ ایجاد بھی حقیقت میں خدا تعالیٰ کی ایجاد ہے۔ تمہارا تو محض نام ہی نام ہے۔ اس لئے یہ شبہ محض لغو ہے۔

دوسرے میں دعویٰ کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ کے یہاں اس وقت بھی پریس موجود ہیں۔ کیونکہ کاتبین اعمال کا لکھا ہوا قیامت تک نہ مٹے گا۔ ایسی سیاہی اور ایسا کاغذ تو کسی پریس کو نصیب نہیں جو قیامت تک باقی رہے تو پھر کاتبین اعمال آپ کے کاموں کو ایسی سیاہی سے روزانہ لکھتے ہیں وہی اگر احکام کو لکھ کر ہر شخص کے پاس ڈال دیا کریں تو کیا مشکل ہے۔ مگر حق تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا بلکہ احکام کو نبی پر نازل کیا اور مخلوق کو نبی کا تابع کیا تاکہ آزادی سلب ہو جائے۔

قانون کی پابندی

جو لوگ جمہوری سلطنت کے حامی ہیں اور حریت و مساوات کے مدعی ہیں وہ بھی آزادی کا ہونا گوارا نہیں کرتے کیونکہ جمہوری سلطنت کے بعد بھی وہ کوئی قانون ہوگا جس کی پابندی عام رعایا پر لازم ہوگی تو اس قانون کے سامنے سب کی آزادی سلب ہو جائے گی ہم تو آزادی کا دعویٰ جب مانیں جب کہ کسی شخص کو بھی قانون کا پابند نہ کیا جائے بلکہ جس کے جو جی میں آئے کرنے دیا جائے کسی سے کچھ مزاحمت نہ کیجاوے کیونکہ تم تو آزادی کے حامی ہو۔ تو آزادی تو اسی کا نام ہے کہ کوئی کسی بات کا پابند نہ ہو۔

پھر تو لوگوں کو قانون کا پابند کیوں بناتے ہو اور ان کی آزادی کو قانون کا تابع کیوں بناتے ہو۔ کم از کم یہی کرو کہ قانون بنانے میں ساری رعایا کی رائے لے لیا کرو۔ قانون سازی کے لئے پارلیمنٹ کی مختصر جماعت کو کیوں خاص کر رکھا ہے۔ اور تمام رعایا کو چند آدمیوں کی رائے کا تابع کیوں بنا رکھا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ جمہوری سلطنت کے حامی ہیں وہ بھی شخصیت ہی کے حامی ہیں مگر شخص کبھی حقیقی ہوتا ہے کبھی حکمی۔ فلسفہ کا مسئلہ یہ ہے کہ مجموعہ بھی شخص واحد ہے مگر وہ واحد حکمی ہے حقیقی نہیں۔ تو یہ لوگ جس پارلیمنٹ کے فیصلوں کا اتباع کرتے ہیں اس میں گو بظاہر بہت سے آدمی ہوتے ہیں مگر مجموعہ مل کر پھر شخص واحد ہے کیونکہ جو قانون پاس ہوتا ہے وہ سب کی رائے سے مل کر پاس ہوتا ہے۔

پارلیمنٹ کی حیثیت

پارلیمنٹ میں بھی ہر شخص آزاد نہیں کہ جو رائے دیدے وہی پاس ہو جایا کرے۔ اگر ایسا بھی ہوتا جب بھی کسی قدر آزادی کا دعویٰ صحیح ہوتا مگر وہاں تو پارلیمنٹ کے بھی ہر شخص کی انفرادی رائے معتبر نہیں بلکہ اجماعی رائے معتبر ہے اور اجتماعی رائے پھر شخصی رائے ہے کیونکہ مجموعہ مل کر واحد حکمی ہو جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ ہم شخص واحد حقیقی کے حامی ہیں اور تم شخص واحد حکمی کے حامی ہو۔ جمہوریت کے حامی تو تم بھی نہ رہے۔ جمہوریت اور آزادی کامل تو جب ہوتی جب ہر شخص اپنے فعل میں آزاد ہوتا کوئی کسی کا تابع نہ ہوتا۔ نہ ایک بادشاہ کا، نہ پارلیمنٹ کے دس ممبروں کا۔ اور یہ کیا آزادی ہے کہ تم نے لاکھوں کروڑوں آدمیوں کو پارلیمنٹ کے دس ممبروں کی رائے کا تابع بنا دیا۔ ہم تو ایک ہی کا غلام بناتے تھے تو نے دس کا غلام بنا دیا۔ تمہیں فیصلہ کر لو کہ ایک کا غلام ہونا اچھا ہے یا دس بیس کا غلام ہونا۔ ظاہر ہے کہ جس شخص پر ایک کی حکومت ہو اس سے بہتر ہے جس پر دس بیس کی حکومت ہو۔

یہ حاصل ہے جمہوری سلطنت کا کہ رعایا کی غلامی سے تو اس کو بھی انکار نہیں مگر وہ یہ کہتی ہے کہ تم دس بیس کی غلامی کرو۔ اور ہم یہ کہتے ہیں کہ صرف ایک کی غلامی کرو۔

شریعت میں یہ خاص بات ہے کہ اس کے دعاوی کہیں نہیں ٹوٹتے۔ شریعت نے آزادی کا ایسے زور سے دعویٰ ہی نہیں کیا جو اس پر نقض وارد ہوا اور جو لوگ آزادی کا دم بھرتے ہیں کسی وقت ان کو اپنے دعویٰ سے ہٹنا پڑتا ہے۔ آخر کیوں ہٹتے ہو؟ اگر کوئی شخص پارلیمنٹ کے فیصلہ کو نہ مانے تو اس کو مجبور کیوں کرتے ہو۔ اسے پارلیمنٹ کا غلام کیوں بناتے ہو۔ آزاد کیوں نہیں رہنے دیتے مگر کیونکر آزاد رہنے دیں۔ نظام عالم بدون اس کے قائم نہیں ہو سکتا کہ مخلوق میں بعض تابع ہوں بعض متبوع ہوں آزادی مطلق سے فساد برپا ہوتے ہیں۔ اسلئے یہاں آ کر ان کو اپنے دعویٰ آزادی سے ہٹنا پڑتا ہے۔ اور شریعت کو کبھی اپنے دعویٰ سے ہٹنا نہیں پڑتا۔ کیونکہ وہ تو پہلے ہی

تابعیت و متبوعیت کی حامی ہے وہ تو آزادی کا سبق سکھاتی ہی نہیں اول ہی دن سے نبی کے اتباع کا حکم دیتی ہے جس سے تمام مخلوق کو ایک کا تابع کردیا۔ بلکہ اگر کسی وقت خدا تعالیٰ نے ایک زمانے میں دو نبی بھی ایک قوم کی طرف ارسال کئے ہیں تو ان میں بھی ایک تابع تھے۔ دوسرے متبوع تھے۔

ایک زمانہ میں دو نبی

چنانچہ حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام ایک زمانہ میں دو نبی تھے جو نبی اسرائیل و قوم قبطار کی طرف مبعوث ہوئے تھے مگر ان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام متبوع تھے، حضرت ہارون علیہ السلام تابع تھے، دونوں برابر درجہ میں نہ تھے اور یہ تابعیت محض ضابطہ کی تابعیت نہ تھی بلکہ واقعی تابعیت تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہارون علیہ السلام پر پوری حکومت رکھتے تھے وہ ان کی مخالفت نہ کرسکتے تھے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے ایک واقعہ ایسا پیدا کردیا جس سے اس حقیقت کا ظہور ہوگیا۔

جب موسیٰ علیہ السلام تورات لینے کے لئے کوہِ طور پر تشریف لے گئے تو ہارون علیہ السلام کو اپنا خلیفہ بناکر چھوڑ گئے تھے کہ میرے پیچھے بنی اسرائیل کا خیال رکھنا اور انکی اصلاح کرتے رہنا۔

قصہ سامری

یہاں پیچھے یہ قصہ ہوا کہ سامری نے ایک سونے کا بچھڑا بنایا اور اس میں قدم جبرئیل علیہ السلام کی مٹی ڈالدی جس سے اس میں حیات پیدا ہوگئی فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى فَنَسِیَ ، جاہل لوگ کہنے لگے کہ ہمارا اور موسیٰ علیہ السلام کا خدا تو یہ ہے وہ بھول کر نہ معلوم کہاں چلے گئے۔ بس بیوقوف لگے اس کی عبادت کرنے۔ موسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے اس واقعہ کی اطلاع دی وہ غصہ میں بھرے ہوئے تشریف لائے۔ اور قوم کی حالت دیکھ کر افسوس ہوا۔ اسی وقت انھوں نے ہارون علیہ السلام سے فرمایا کہ جب یہ کم بخت گمراہ ہوگئے تھے تو تم یہاں کیوں رہے میرے پاس باقی ماندہ جماعت لے کر کیوں نہ چلے آئے اور غصہ میں ان کا سر اور ڈاڑھی پکڑ کر کھینچنے لگے قَالَ يَا ابْنَ اُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِیْ وَلَا بِرَاْسِیْ ہارون علیہ السلام نے کہ اے بھائی میری ڈاڑھی اور سر نہ پکڑو۔ میری بات سنو مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ اگر میں انکو چھوڑ کر چل دوں گا تو آپ یہ نہ کہیں کہ تو نے وہاں رہ کر انکو سمجھایا کیوں نہیں انکی اصلاح کیوں نہ کی اسلئے میں یہیں رہ کر ان کو سمجھاتا رہا حالانکہ ہارون علیہ السلام عمر میں موسیٰ علیہ السلام سے بڑے تھے مگر نبوت میں ان کے تابع تھے اسلئے موسیٰ ؑ نے بے تکلف اپنی متبوعیت اور ان کی تابعیت کے مقتضیٰ پر عمل کیا اور وہ برتاؤ جو حاکم محکوم کے ساتھ کرتا ہے۔ آج ایک سب انسپکٹر باوجودیکہ

انسپکٹر کا تابع اور ماتحت ہوتا ہے۔ مگر انسپکٹر اپنے ماتحت کے ساتھ ایسا کرکے تو دیکھیں۔

تابع اور متبوع

معلوم ہوا کہ ہارون علیہ السلام کی تابعیت محض ضابطہ کی نہ تھی بلکہ واقعی تابعیت تھی، جس کا اس واقعہ سے ظہور ہوگیا۔ اور لوگوں کو معلوم ہوگیا کہ دونوں رسولوں میں ایک تابع ہیں ایک متبوع ہیں اور دونوں یکساں مرتبے میں نہیں ہیں۔

اس واقعہ سے بعض لوگوں کو تعجب ہوتا ہوگا کہ موسیٰ علیہ السلام کے اس فعل میں کیا حکمت تھی۔ لیجئے ایک حکمت تو میرے قلب پر اسی وقت آگئی کہ حق تعالیٰ کو متبوعیت اور تابعیت کا ظاہر کرنا تھا اسلئے موسیٰ علیہ السلام کو غصہ سے ایسا بیتاب کردیا جس سے انھوں نے اپنی حکومت و متبوعیت کے مقتضیٰ پر بے تکلف عمل کیا اور نہ معلوم کتنی حکمتیں ہوں گی۔

شخصی حکومت

غرض اسلام میں جمہوری سلطنت کوئی چیز نہیں۔ اسلام میں محض شخصی حکومت کی تعلیم ہے اور جن مفاسد کی وجہ سے جمہوری سلطنت قائم کی گئی ہے وہ سلطنتِ شخصی میں تو محتمل ہی ہیں اور جمہوری میں متیقن ہیں۔ شخصی سلطنت میں یہ خرابیاں بیان کیجاتی ہیں کہ اس میں ایک شخص کی رائے پر سارا انتظام چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ جو چاہے کرے۔ حالانکہ ممکن ہے کہ کسی وقت اس کی رائے غلط ہو۔ اس لئے ایک شخص کی رائے پر سارا انتظام نہ چھوڑنا چاہیئے بلکہ ایک جماعت کی رائے سے کام ہونا چاہیئے۔ میں کہتا ہوں کہ جس طرح شخصی سلطنت کے بادشاہ کی رائے میں کبھی غلطی کا احتمال ہے اسی طرح جماعت کی رائے میں بھی غلطی کا احتمال ہے کیونکہ یہ ضرور نہیں کہ ایک شخص کی رائے ہمیشہ غلط ہوا کرے۔ اور دس کی رائے ہمیشہ صحیح ہوا کرے بلکہ ایسا بھی بکثرت ہوتا ہے کہ بعض دفعہ ایک شخص کا ذہن وہاں پہونچتا ہے جہاں ہزاروں آدمیوں کا ذہن نہیں پہونچتا۔ ایجاداتِ عالم میں رات دن اس کا مشاہدہ ہوتا ہے کیونکہ جتنی ایجادات ہیں وہ اکثر ایک شخص کی عقل کا نتیجہ ہیں کسی نے کچھ سمجھا کسی نے کچھ سمجھا۔ ایک نے تار برقی کو ایجاد کیا۔ ایک نے ریل کو ایجاد کیا۔ تو موجد اکثر ایک شخص ہوتا ہے اور اس کا ذہن وہاں پہونچتا ہے۔ جہاں صدہا ہزارہا مخلوق کا ذہن نہیں پہونچتا۔ علوم میں بھی یہ امر مشاہد ہے کہ بعض دفعہ ایک شخص کسی مضمون کو اسطرح صحیح حل کرتا ہے کہ تمام شراح و محشین کی تقریریں اس کے سامنے غلط ہوجاتی ہیں۔ تو جماعت کی رائے کا غلط ہونا بھی محتمل ہے۔ اب بتلائیے اگر کسی وقت بادشاہ کی رائے صحیح ہوئی اور پارلیمنٹ کی رائے غلط ہوئی تو عمل کس پر ہوگا۔ جمہوری سلطنت میں کثرت رائے پر فیصلہ ہوتا ہے تو بادشاہ اپنی رائے پر

عمل نہیں کرسکتا بلکہ یہ کثرتِ رائے سے مغلوب ہوکر غلط رائے کی موافقت پر مجبور ہوتا ہے اور شخصی سلطنت میں بادشاہ اپنی رائے پر ہر وقت عمل کرسکتا ہے۔ اور جمہوری میں اگر کثرتِ رائے غلطی پر ہوئی تو صحیح رائے پر عمل کرنے کی کوئی صورت نہیں سب مجبور ہیں غلط رائے کی موافقت پر۔ اور یہ کتنا بڑا ظلم ہے۔ اس لیے یہ قاعدہ ہی غلط ہے کہ کثرت رائے پر فیصلہ کیا جائے۔ بلکہ قاعدہ یہ ہونا چاہیئے کہ صحیح رائے پر عمل کیا جاوے خواہ وہ ایک ہی شخص کی رائے ہو

سرسید اور مولانا محمد حسین میں مکالمہ

مولانا محمد حسین صاحب الٰہ آبادی نے سید احمد خان سے کہا تھا کہ آپ لوگ جو کثرتِ رائے پر فیصلہ کرتے ہیں اس کا حاصل یہ ہے کہ حماقت کی رائے پر فیصلہ کرتے ہو کیونکہ قانونِ فطرت یہ ہے کہ دنیا میں عقلاء کم ہیں اور بیوقوف زیادہ۔ تو اس قاعدہ کی بنا پر کثرتِ رائے کا فیصلہ بیوقوفی کا فیصلہ ہوگا۔ سید احمد خاں نے جواب دیا کہ دنیا میں جو عقلاء کی قلت اور بیوقوفوں کی کثرت ہے یہ اس صورت میں ہے جب کہ بہت سے آدمیوں کو کیف ما اتفق جمع کرلیا جاوے تو ان میں واقعی بیوقوف زیادہ ہوں گے لیکن جن لوگوں کی کثرتِ رائے پر فیصلہ کرتے ہیں وہ کیف ما اتفق جمع نہیں کیے جاتے بلکہ انتخاب کرکے خاص خاص آدمیوں کی کمیٹی بنائی جاتی ہے جس میں سب عقلاء ہی ہوتے ہیں تو ان میں جس طرف کثرت ہوگی وہ بیوقوں کی کثرت نہ ہوگی بلکہ عقلاء کی کثرت ہوگی مولانا نے جواب دیا کہ بہت اچھا۔ لیکن عقلاء میں بھی قانون فطرت یہ ہے کہ کامل العقل تھوڑے ہیں اور ناقص العقل زیادہ۔ چنانچہ تجربہ کرلیا جائے کہ ہزار عاقلوں میں کامل العقل ایک دو ہی ہوتے ہیں تو عقلاء میں بھی کثرت انھیں لوگوں کی ہے جو ناقص العقل ہیں۔ پس کثرت رائے پر فیصلہ اگر حماقت کا فیصلہ نہیں تو کم عقلی کا فیصلہ تو ضرور ہی ہوگا۔ سید احمد خاں کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ بالکل خاموش ہی ہوگئے

کثرتِ رائے

غرض صحیح رائے پر عمل کرنا بدون شخصی حکومت کے ممکن نہیں جمہوری میں تو کثرتِ رائے کا اتباع لازم ہے خواہ وہ غلط ہو یا صحیح ہو بلکہ مولانا محمد حسین صاحب کے موافق کثرتِ رائے اکثر غلط ہی ہوگی تو گویا جمہوری میں اکثر غلط رائے پر عمل ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ جب تک صحیح رائے پر عمل نہ ہوگا اس وقت تک انتظام درست نہیں ہوسکتا۔ پس ثابت ہوگیا کہ انتظام بدون شخصی حکومت کے نہیں ہوسکتا۔ دوسرے جو لوگ کثرتِ رائے پر فیصلہ کا مدار رکھتے ہیں۔ وہ بادشاہ کو تنہا فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں دیتے۔ وہ پہلے ہی سے اس کو تسلیم

کرتے ہیں۔ کہ ہمارا بادشاہ ایسا ضعیف الرائے ہے کہ اس کی تنہا رائے قابل اعتبار نہیں اور وہ نا اہل ہے۔ تو واقعی جو لوگ اپنے بادشاہ کو ایسا سمجھتے ہیں ہم ان سے گفتگو نہیں کرتے انکو جمہوریت مبارک ہو۔ ایسا نا اہل بادشاہ ہرگز اس قابل نہیں کہ اس کو شخصی سلطنت کا بادشاہ بنالیا جائے۔ اسلام میں جو شخصی سلطنت کی تعلیم ہے تو اس کے ساتھ یہ بھی حکم ہے کہ اے اہل حل وعقد اور اے جماعتِ عقلاء بادشاہ ایسے شخص کو بناؤ جو اتنا صائب الرائے ہو کہ اگر کبھی اس کی رائے سارے عالم کے بھی خلاف ہو تو یہ احتمال ہوسکے کہ شاید اسی کی رائے صحیح ہو۔ اور جس کی رائے میں اتنی زرانیت نہ ہو اسکو ہرگز بادشاہ نہ بناؤ۔ اب بتلاؤ کہ جس کی رائے اتنی زریں ہو کہ سارے عالم کے مقابلہ میں بھی اسکی رائے کے صائب ہونے کا احتمال ہو وہ حکومت شخصی کے قابل ہے یا نہیں؟ یقیناً قابل ہے بشرطیکہ اہل حل وعقد انتخاب میں خیانت نہ کریں۔

شخصی سلطنت

بس ہم شخصی سلطنت کے اس لئے حامی ہیں کہ ہم بادشاہ کو زرین العقل صائب الرائے سمجھتے ہیں اور تم کثرت رائے کے اس لئے حامی ہو کہ تم اپنے بادشاہ کو ضعیف الرائے اور نا اہل سمجھتے ہو۔ تو ایسے شخص کو بادشاہ بنانے کی ضرورت ہی کیا ہے جسکے لئے ضم ضمیمہ کی ضرورت ہو بلکہ پہلے ہی سے بادشاہ ایسے شخص کو بناؤ جو ضم ضمیمہ کا محتاج نہ ہو مستقل الرائے ہو۔ اور اگر تم بھی اپنے بادشاہ کو مستقل الرائے صائب العقل زریں سمجھتے ہو تو پھر کثرتِ رائے پر فیصلہ کا مدار رکھنا اور کامل کو ناقصین کی رائے کا تابع بنانا ظلم ہے جس کا حماقت ہونا بدیہی ہے۔

بعض لوگوں کو یہ حماقت سوجھی ہے کہ وہ جمہوری سلطنت کو اسلام میں ٹھونسنا چاہتے ہیں اور اور دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام میں جمہوریت ہی کی تعلیم ہے اور استدلال میں یہ آیت پیش کرتے ہیں کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ[1] مگر یہ بالکل غلط ہے۔ ان لوگوں نے مشورہ کی دفعات ہی کو دفع کردیا اور اسلام میں مشورہ کا جو درجہ ہے اس کو بالکل نہیں سمجھا۔

حضرت بریرہؓ کا واقعہ

اسلام میں مشورہ کا درجہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا کہ اے بریرہؓ تم اپنے شوہر سے رجوع کرلو۔ قصہ یہ ہوا کہ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا۔ پہلے باندی تھیں اور

---

[1] اور تم معاملات میں ان سے مشورہ کرو۔

اور اسی حالت میں ان کا نکاح ایک شخص سے جن کا نام مغیث تھا ان کے آقا نے کر دیا تھا۔ جب وہ آزاد ہوئیں تو قانونِ اسلام کے مطابق ان کو یہ اختیار دیا گیا کہ جو نکاح حالت غلامی میں ہوا تھا اگر چاہیں اس کو باقی رکھیں اگر چاہیں فسخ کر دیں۔ اصطلاح شریعت میں اس کو اختیار عتق کہتے ہیں اس اختیار کی بنا پر حضرت بریرہؓ رضی اللہ عنہ نے نکاحِ سابق کو فسخ کر دیا لیکن ان کے شوہر کو ان سے محبت تھی۔ وہ صدمۂ فراق میں مدینہ کی گلی کوچوں میں روتے پھرتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر رحم آیا اور حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا سے آپ نے فرمایا کہ اے بریرہ کیا اچھا ہو اگر تم اپنے شوہر سے رجوع کر لو۔ تو وہ دریافت فرماتی ہیں کہ یا رسول اللہ یہ آپ کا حکم ہے یا مشورہ کی ایک فرد ہے۔ اگر حکم ہے تو بسر و چشم منظور ہے گو مجھ کو تکلیف ہی ہو آپ نے فرمایا حکم نہیں صرف مشورہ ہے۔ تو حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا نے صاف عرض کر دیا کہ اگر مشورہ ہے تو میں اس کو قبول نہیں کرتی۔

مشورہ کا درجہ

لیجئے اسلام میں یہ درجہ ہے مشورہ کا کہ اگر نبی اور خلیفہ تو بدرجہ اولیٰ رعایا کے کسی آدمی کو کوئی مشورہ دیں تو اس کو حق ہے کہ مشورہ پر عمل نہ کرے اور یہ محض ضابطہ کا حق نہیں بلکہ واقعی حق ہے چنانچہ جب حضرت بریرہؓ نے حضور کے مشورہ پر عمل نہ کیا تو حضورؐ نے ان سے ذرا بھی ناراض نہیں ہوئے نہ حضرت بریرہ کو کچھ گناہ ہوا نہ ان پر کچھ عتاب ہوا۔ سو جب امت یا رعایا اپنے نبی یا بادشاہ کے مشورہ پر عمل کرنے کے لئے اسلام میں مجبور نہیں تو نبی یا خلیفہ رعایا کے مشورہ سے کیونکر مجبور ہو جائے گا کہ رعایا جو مشورہ دے اسی کے موافق عمل کرے اس کے خلاف کبھی نہ کرے پس شاورھم فی الامر سے صرف یہ ثابت ہوا کہ حکام رعایا سے مشورہ کر لیا کریں یہ کہاں ثابت ہوا کہ ان کے مشورہ پر عمل بھی ضرور کیا کریں اور اگر کثرتِ رائے بادشاہ کے خلاف ہو جائے تو وہ کثیرین کے مشورہ پر عمل کرنے کیلئے مجبور ہے۔ اور جب تک یہ بات ثابت نہ ہو اس وقت تک شاورھم فی الامر سے جمہوریت ہرگز ثابت نہیں ہو سکتی۔ جب اسلام میں ایک معمولی آدمی بھی بادشاہ کے مشورہ پر مجبور نہیں ہوتا تو تم بادشاہ کو رعایا کے مشورہ پر کیوں کر مجبور کرتے ہو۔ آخر اس کی کوئی دلیل بھی ہے یا محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔ اور ہمارے پاس حدیث بریرہ رضی اللہ عنہا سے دلیل موجود ہے کہ کسی کے مشورہ پر عمل کرنا ضروری نہیں خواہ نبی ہی کا مشورہ کیوں نہ ہو۔

مشورہ پر عمل ضروری نہیں

اس سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ اگر حکام رعایا سے مشورہ لیں تو وہ ان کے مشورے پر عمل کرنے کیلئے مجبور ہرگز نہیں ہیں بلکہ عمل خود اپنی رائے پر کریں خواہ وہ دنیا بھر کے مشورہ کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

چنانچہ اس آیت میں آگے ارشاد ہے فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ کے مشورے کے بعد جب آپ ارادہ کسی بات کا کریں تو خدا پر بھروسہ کر کے اس پر عمل کریں یہاں اِذَا عَزَمْتَ صیغہ واحد ہے۔ معلوم ہوا کہ عزم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم مستقل تھے۔ اسی طرح آپ کا نائب یعنی سلطان بھی عزم میں مستقل ہے۔ اگر عزم کا مدار کثرتِ رائے پر ہوتا تو اِذَا عَزَمْتَ نہ فرماتے بلکہ اس کی بجائے اذا عزم اکثرکم فتوکلوا علی اللہ فرماتے۔ پس جس آیت سے یہ لوگ جمہوریت پر استدلال کرتے ہیں اس کا اخیر جزو خود ان کے دعویٰ کی تردید کر رہا ہے مگر انکی حالت تو یہ ہے حفظت شیئاً وغابت عنک اشیاء کہ ایک جزو کو دیکھتے ہیں اور دوسرے جزو سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ دوسرے اس آیت میں صرف حکام کو یہ کہا گیا ہے کہ وہ رعایا سے مشورہ کر لیا کریں۔ رعایا کو تو یہ حق نہیں دیا گیا۔ کہ از خود استحقاقاً حکام کو مشورہ دیا کریں چاہے وہ مشورہ لیں یا نہ لیں اہل مشورہ انکو مشورہ سننے پر مجبور کر سکیں چنانچہ شریعت میں اشیروا الحکام وھو حقکم علیھم، کہیں نہیں کہا گیا۔ جب رعایا کو از خود مشورہ دینے کا کوئی حق بدرجۂ لزوم نہیں تو پھر اسلام میں جمہوریت کہاں ہوئی۔ کیونکہ جمہوریت میں تو پارلیمنٹ کو از خود رائے دینے کا حق ہوتا ہے چاہے بادشاہ ان سے رائے لے یا نہ لے۔ یہاں تک کہ اگر بادشاہ پارلیمنٹ سے بغیر رائے لئے کوئی حکم نافذ کر دے تو اس پر چاروں طرف سے لے دے ہوتی ہے کہ ہم سے بدوں مشورہ لئے یہ حکم کیوں جاری کیا گیا۔ بھلا رعایا کو یہ حکم میں اسلام میں کہاں دیا گیا ہے ذرا کوئی صاحب ثابت تو کریں۔ پس یہ دعویٰ بالکل غلط ہے کہ اسلام میں جمہوریت کی تعلیم ہے۔ (تقلیل الاختلاط مع الانام ص۱۸)

(۱۲) امن عامہ کامل طور پر دین پر قائم ہونے سے ہی حاصل ہو سکتا ہے

مولوی اسی کو روتے ہیں کہ آپ کے گھر میں آگ لگی ہے۔ لیکن آپ کو خبر نہیں، صاحبو! غضب ہے کہ غیر قومیں تو اسلام کی تعریف کرتی چلی آ رہی ہیں اور ہم اسلام کو چھوڑتے چلے جا رہے ہیں۔ غرض چونکہ ہم لوگوں نے دین کا ست نکال لیا ہے اس لئے میں بتلاتا ہوں کہ دین واقع میں چند چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے اور وہ پانچ چیزیں ہیں عقائد[۱]، عبادات[۲]، معاملات[۳]، آداب[۴]، معاشرت[۵] اخلاق باطنی، یعنی یہ کہ تکبر نہ ہو ریاء نہ ہو، تواضع ہو، اخلاص ہو۔

قناعت ہو، شکر ہو، صبر ہو، وعلیٰ ہذا۔ پس ان پانچ چیزوں کا نام دین ہے اس وقت کسی نے کسی کو کسی نے کسی کو چھوڑ رکھا ہے۔ کسی نے اعمال کو چھوڑا کسی نے معاملات کو، کسی نے معاشرت کو، اسی طرح اپنی معاشرت کو چھوڑ کر غیروں کی معاشرت کو اختیار کر لیا ہے۔ اور بعض نے اخلاق باطنی کو چھوڑ دیا ہے۔ بلکہ ان اخیر کے دو جزوں کو تو قریب قریب سب ہی نے چھوڑ دیا ہے اس تفصیل کے بعد حاصل آیت شریف کا یہ ہوا کہ دین کو یعنی ان پانچ چیزوں کو اصلاح فی الارض میں اور ان پانچوں کے اخلال کو انساد فی الارض میں دخل ہے۔ پس اب کو دیکھ دیجئے۔ مشاہدۃً کہ اصلاح فی الارض میں جدا جدا ہر ایک کا کیا دخل ہے۔ سنو! بعض کا دخل تو بیّن ہے۔ مثلاً اخلاق کے ان اثر امن عام میں بین ہے اور ذرا سی غور سے معاملات کا اثر بھی امن عام میں ظاہر ہو جاتا ہے کیونکہ احکام معاملہ کا حاصل حقیقت یہ ہے کہ کسی کا حق ضائع نہ کیا جائے۔ پس معاملات کو بھی اتفاق میں بڑا اثر ہے بشرطیکہ وہ شریعت کے موافق ہوں۔ کیونکہ آپ کی رائے ان مصالح کی رعایت نہیں کر سکتی جیسی کہ شریعت نے کی ہے۔ جیسے پھل فروخت کرنا کہ آپ نے قبل از وقت پھل فروخت کئے تو اس صورت کو شریعت نے حرام کیا ہے۔ کیونکہ پھل آنے سے پہلے فروخت کرنے میں معدوم کی بیع ہے اور بیع معدوم میں کسی نہ کسی کا ضرر ضرور ہوتا ہے۔ اور شریعت کے موافق کرنے میں کسی کا ضرر نہیں۔ تو امن قائم ہوگا۔ تو ان دونوں کا اثر تو دنیا کے انتظام میں صاف معلوم ہوتا ہے باقی اور تین چیزوں کا امن عام میں دخیل ہونا سو یہ کم ظاہر ہے اس لئے اس کو بھی ثابت کرنا ضروری ہے کہ یہ تین چیزیں بھی امن عام میں دخیل ہیں۔

عقائد

سو اول یعنی عقائد کو تو یوں سمجھو کہ توحید اور رسالت اور معاد، ام العقائد ہیں اور ان سب کو امن عام میں دخیل مان لیا ہے اس کی تسلیم سے یہ دعویٰ بھی ثابت ہو جائیگا ایک مثال بطور نمونہ کے عرض کرتا ہوں کہ مثلاً اخلاق میں جھوٹ نہ بولنا، سچ بولنا، ہمدردی کرنا، خود غرضی نہ کرنا داخل ہے اور یہ اصول تمدن میں سے بہت بڑی چیزیں ہیں جن پر تمام دنیا کا مدار ہے لیکن واقعات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہ اخلاق دو شخصوں میں پائے جائیں جنمیں ایک تو توحید و رسالت کا قائل ہے۔ اور دوسرا قائل نہ ہو تو یقیناً دونوں میں بہت بڑا فرق ہوگا۔ یعنی منکر توحید میں تو یہ اخلاق محدود العمر ہوں گے، اس طرح سے کہ جب تک ان اخلاق پر عمل کرنے میں اس کے دنیاوی منافع فوت نہ ہوں یا اس کے خلاف عمل کرنے سے دوسروں کو خبر ہو کر رسوائی کا اندیشہ ہو اس وقت تو ان اخلاق پر عمل کیا جائے گا اور اگر کوئی ایسا موقع آ پڑے گا کہ ان اخلاق

عمل کرنے سے دنیوی ضرر ہوتا ہو اور ان کے خلاف کرنے میں کسی کو خبر بھی نہ ہو جس میں اندیشہ بدنامی نہ ہو تو اس منکر توحید و رسالت کو کبھی ان اخلاق کے ترک کی پروا نہ ہوگی۔ ہم آئے دن دیکھتے ہیں کہ جب کبھی بے دین سلطنتوں میں آپس میں معاہدہ ہوتا ہے تو اس کی پابندی اسی وقت تک کی جاتی ہے جب تک اپنے منافع حاصل ہوتے ہیں یا خلاف کرنے میں اپنا ضرر ہوتا ہے اور اگر خلاف کرنے میں اپنا ضرر نہ ہوتا ہو تو عہد شکنی میں ذرا بھی پس و پیش نہیں ہوتا۔

مذہبی طاقت کی مثال

یا فرض کرو کہ دو شخص ہم سفر ہوں جن میں ایک کے پاس ایک لاکھ روپئے کے نوٹ ہوں اور دوسرا ایسا ہو کہ اس پر فاقے گذرتے ہوں اور اتفاق سے وہ متمول انتقال کر جائے۔ اور دوسرے رفیق سفر کو ان نوٹوں کے لے لینے کا موقعہ ملے اور عاقل بھی اتنا بڑا ہو کہ بلا تکلف انکو فروخت کر سکے اور اس مرحوم کے ورثہ میں بھی صرف ایک نابالغ بچہ ہو اور ان نوٹوں کی کسی اور کو خبر بھی نہ ہو کہ اس شخص کے پاس یہ ذخیرہ ہے اس صورت میں اخلاق اور نفس میں کشاکش ہوگی۔ اخلاق کا فتویٰ تو یہ ہوگا کہ یہ روپیہ اس وارث کو دینا چاہیئے اور نفس کا فتویٰ یہ ہوگا کہ جب اس روپے کے رکھ لینے میں کوئی بدنامی نہیں۔ کسی قسم کا اندیشہ نہیں تو پھر اس کو کیوں نہ رکھ لیا جاوے۔ اس کشاکشی میں میں نہیں سمجھتا کہ نری اخلاقی قوت انسان کو اس عظیم مہلکہ سے بچا لے پس جس شخص کو نری اخلاقی تعلیم ہوئی ہے وہ ہرگز اس خیانت سے نہیں بچ سکتا، البتہ جو اخلاقی تعلیم کے ساتھ خدا اور قیامت کا بھی قائل ہے وہ اس سے بچ سکتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر میں یہاں بچ گیا اور مجھے دنیا میں خمیازہ بھگتنا نہ پڑا تو قیامت میں تو ضرور ہی بھگتنا پڑے گا۔

خوف خدا کا اثر

اسی طرح ایک اور جزئی یاد آ گئی کہ میرے پاس اکثر ایسے ٹکٹ آ جاتے ہیں کہ ڈاک خانے کی مہر سے بالکل بچے ہوئے ہوتے ہیں۔ اگر میں ان کو استعمال کر لوں تو کوئی بھی بازپرس نہیں کر سکتا کیونکہ نہ میرے پاس ڈاکخانے والے ہوتے ہیں نہ کوئی دوسرا دیکھنے والا ہوتا ہے لیکن محض خدا کے خوف سے اکثر میں سب سے اول ان ہی کو چاک کر کے پھینک دیتا ہوں۔ اس کے بعد خط پڑھتا ہوں علیٰ ہذا اگر روزمرہ کے واقعات کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دوسروں کے حقوق کی پوری حفاظت جب ہی ہو سکتی ہے جب دل میں خدا کا خوف ہو۔ یہ مثال نمونہ کے طور پر بیان کی ورنہ غور سے معلوم ہوگا کہ تمام مسائل تمدن میں اس کی ضرورت ہے کہ مبدأ اور معاد کا معتقد ہو۔ اس کی تفصیل کے لئے رسالہ مآل التہذیب

دیکھنے کے قابل ہے اس میں دکھلایا ہے کہ اس مخترع تہذیب کا مآل دنیا ہی میں ہونے والا ہے۔ انھوں نے ایک مفسدہ کو لکھا ہے۔ اور ختم پر ہر جگہ یہ کہدیتے ہیں فویل یومئذٍ للمعذبین
غرض امن عام اور تمدن اس وقت باقی رہ سکتا ہے جب اخلاق درست ہوں اور اخلاق کی کامل درستی جب ہی ہوسکتی ہے کہ عقائد درست ہوں۔

اعمال کا دخل

اب اعمال کا دخل لیجئے۔ یہ بھی انشاء اللہ اخلاق کی ضرورت تسلیم کرلینے سے ثابت ہو جائے گا۔ سب کو معلوم ہے کہ اخلاق میں بڑی چیز تواضع ہے۔ اس کے نہ ہونے سے تمام عالم میں فساد پھیلتا ہے کیونکہ فساد کا مبنیٰ ہے نااتفاق اور نااتفاقی تکبر سے پیدا ہوتی ہے کیونکہ اگر تکبر نہ ہو اور آپ مجھ کو بڑا مانیں اور میں آپ کو بڑا مانوں تو نااتفاقی کی کوئی وجہ نہیں۔

تو اتفاق کے لئے تواضع کے پیدا کرنے اور تکبر کے مٹانے کی ضرورت ہے۔ اور اس تواضع کی عادت نماز سے خوب ہوتی ہے۔ نفس کا یہ خاصہ ہے کہ اگر کہیں اس کو ذلت سکھائی جائے تو اس میں فرعونیت پیدا ہوتی اور نماز میں تو اول سے اللہ اکبر کی تعلیم ہے۔ تو جو شخص پانچ وقت زبان سے اور دل سے اللہ اکبر کہے گا اور جوارح سے رکوع اور سجدہ کرے گا۔ زمین پر پیشانی رکھے گا وہ کیونکر اپنے کو بڑا سمجھے گا۔

خدا کی خدائی پر اعتقاد کا نتیجہ

اگر کہو اس سے تو یہ ہوگا کہ اپنے کو خدا سے بڑا نہ سمجھے گا لیکن دوسروں سے تو بڑا نہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں۔

جواب یہ ہے کہ یہ ناتجربہ کاری کا اعتراض ہے۔ دیکھو اگر تحصیلدار اپنے جوش حکومت میں تحصیلداری کر رہا ہو اور اچانک لفٹنٹ گورنر آجائے تو خود اسکے ذہن میں بھی وجداناً سب اختیارات مسلوب ہونے لگتے ہیں اس وقت اگر کوئی حضور بھی کہدیتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے گولی ماردی تو جس کے دل میں خدا کی عظمت ہوگی وہ اپنے کو چیونٹی سے بھی مغلوب و ناتواں سمجھے گا کیونکہ بڑوں کے سامنے ہوتے ہوئے چھوٹوں پر بھی حکومت نہیں رہتی۔ تو اللہ اکبر کی وہ تعلیم ہے کہ اس سے تکبر کی بالکل جڑ کٹ جاتی ہے اور پھر اس سے نااتفاقی کا جاتا رہنا لازمی ہے۔

اعمال دین کے اثرات

علیٰ ہذا قوتِ بہیمیہ سے سینکڑوں فساد لڑائی جھگڑے دنیا میں ہوتے ہیں اور روزہ سے قوت بہیمیہ ٹوٹتی ہے

اسی طرح زکوٰۃ لینے والے کے علاوہ دوسروں کو بھی زکوٰۃ دینے والے کے ساتھ محبت ہوتی ہے۔

دیکھو حاتم طائی بوجہ سخاوت کے سب کو محبت ہے اور اتفاق کا مبنیٰ یہی محبت ہے تو دیکھو زکوٰۃ کو اتفاق میں کتنا بڑا دخل ہے۔

علیٰ ہذا حج پر غور کیجئے کہ اس میں ساری دنیا کے آدمی ایک شغل میں، ایک زمانہ میں ایک مکان میں جمع ہوتے ہیں اور تمام سامان تکبر سے خالی ہو کر ایک عظیم الشان دربار میں حاضر ہوتے ہیں جس کو اتفاق واتحاد میں بہت دخل ہے جیسا اوپر مذکور ہوا۔ اور اسی اتفاق فی الخیال کا اثر ہے کہ دوسرے مجمعوں میں جن کو مجمع حجاج سے کچھ بھی نسبت نہیں ہوئی بہت سی واردات ہو جاتی ہیں اور وہاں بہت کم حادثے پیش آتے ہیں۔

البتہ اکثر لوگ شاید بدوؤں[1] کے شاکی ہوں گے۔ سو اصل میں ان کا مقصود سلب و قتل نہیں ہے بلکہ وہ ایک درجہ میں حجاج کی بے پروائی کا انتقام لیتے ہیں ان کی حالت بالکل یہاں کے گاڑیبانوں کی سی ہے کہ اگر گھاس دانہ زیادہ دے دیا تو خوش ہیں ورنہ پھر دیکھئے کیسے پیر پھیلاتے ہیں۔ ویسے ہی اگر بدوؤں کی مدارات کیجائے انکو انعام کے طور پر کچھ زیادہ دیدیا جائے تو وہ بہت آرام پہونچاتے ہیں۔

اور یہ جو سننے میں آتا ہے بدو پتھر مار کر مال چھین لیتے ہیں۔ تو اول تو بہت کم ایسا ہوتا ہے اور اگر ہوتا بھی ہے تو ایسے بدوؤں کے ہاتھ سے جو اس مجمع کے نہیں بلکہ وادیوں میں دیہات کے لوگ پھیلے رہتے ہیں۔ وہ ایسی حرکتیں کرتے ہیں اور وہ بھی اس وقت جب کہ خود اپنی حفاظت نہ کرے کہیں قافلے سے آگے پیچھے رہ جائے۔

غرض حجاج کو اتفاق دامن میں بہت بڑا دخل ہے جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اعمال ازسرتاپا تواضع سے پُر ہیں۔

اب رہی معاشرت۔ سو تأمل سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے جتنے طریقے ناجائز ہیں وہ سب کے سب وہی ہیں جن سے تکبر ٹپکتا ہے۔ مثلاً ناجائز وضع سے شریعت نے منع کیا۔ سو جتنی ناجائز اوضاع ہیں ان سب میں تکبر ہے۔ جو لوگ خلافِ شریعت وضع رکھتے ہیں وہ غور کریں کہ

---

[1] الحمد للہ کہ سلطان کے حسن انتظام کی وجہ سے آجکل بدوؤں کی یہ تمام شکایتیں رفع ہوگئی ہیں۔ ۱۲ علی محمد

اس وقت ان کے دل کی کیا حالت ہے اور اس حالت کو یاد رکھیں اور پھر ایک ہفتہ شریعت کے موافق وضع لباس اختیار کرکے اس کا اثر دیکھیں تو ان کو زمین و آسمان کا فرق معلوم ہوگا۔ یہ توسمجھ میں آنے والی تقریر ہے۔

عقائد و اعمال کی خاصیت

ایک دوسری تقریر اور ہے جو ان تینوں میں مشترک ہے وہ یہ کہ ہر چیز میں ایک خاصیت ہوتی ہے۔ پس اس طرح اعمال میں بھی ایک خاصیت ہے اور عقائد میں بھی اور معاشرہ میں بھی اور وہ یہ کہ ان سب سے قلب میں ایک سوز پیدا ہوتا ہے اور اس سوز سے اس کی وہ حالت پیدا ہوجاتی ہے۔ المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ۔

اب میں ایک اور بات کہتا ہوں جو تمام اجزاء دین کو عام ہے وہ یہ کہ دین کی یہ غرض ہی نہیں کہ دنیاوی نفع ہو بلکہ مقصود اس سے رضائے حق ہے اور جب خدا تعالیٰ راضی ہوں گے تو وہ خود ہی اس کی تمام مصالح دنیویہ کی رعایت فرمالیں گے۔ من یتق اللہ یجعل لہ مخرجا ویرزقہ من حیث لا یحتسب۔

پس دین کی درستی کو اس طرح دنیا کی درستی میں دخل ہوا مگر دین کے کام اس نیت سے بھی نہ کرنا کہ خدا راضی ہوگا تو دنیا کے کام بنیں گے بلکہ صرف اسلئے کہ ؎

دلارامی کہ داری دل درو بند ∴ دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

اور جو مصلحتیں سامنے آئیں بھی تو یہ پڑھ دو کہ ؎

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار ∴ بگزارند و خم طرۂ یارے گیرند

رند عالم سوز را با مصلحت بینی چہ کار ∴ کار ملک ست آنکہ تدبیر و تحمل بایدش

ہمیں مصلحتوں سے کیا لینا مگر حاصل ضرور ہونگی۔ وفادار نوکر وہ ہے کہ آقا کی رضامندی کو اپنی مصلحت پر مقدم رکھے۔ اور کوئی کام اس کی مرضی کے خلاف نہ کرے ورنہ اس کو خود غرض اور خود کام کہا جائے گا۔ پھر آقا اپنے کرم سے خود ہی اس کی مصلحتوں کی رعایت فرمائے گا۔ اور اگر دیکھا جائے تو راحت بھی اسی میں ہے کہ کسی کے حکم کے تابع رہے چاہے مصلحت سمجھ میں آئے یا نہ آئے اور اگر ہر کام میں مصلحت سوچتا رہے تو کام کچھ نہ کر سکے گا۔

میں نے تین تقریریں کیں۔ ہر تقریر سے یہ ثابت ہوگیا کہ دین کو، طاعت کو امن عام میں بہت دخل ہے اور یہ تین تقریریں اس لئے کیں کہ مذاق مختلف ہیں۔ یہ تو اعد دینیہ کی

خوبی ہے کہ ان سے ہر مذاق کے پسند پر دین کا حسن ثابت ہوگیا تو دین گویا اس شعر کا مصداق ہی ہے ؎

بہار عالم حسنش دل وجاں تازہ می دارد

برنگ اصحاب صورت را ببو ارباب معنی را

غرض جس پہلو سے چاہو پرکھ لو، الحمدللہ یہ بات ثابت ہوگئی کہ امن کی صورت ہے تو احکام خداوندی کی پابندی سے ہے۔ (ضرورۃ العلماء ص ۲۳)

۱۳- دین میں تنگی اور دشواری نہیں ہے

اس کے دو درجے ہیں ایک تو یہ کہ قانون کی پابندی کرنا پڑتی ہے اور یہ دشوار ہے۔ اور ایک یہ کہ خود قانون ہی سخت ہے۔ تو اسلام میں کون سی دشواری ہے آیا یہ کہ خود قانون کی پابندی کرنی پڑتی ہے تو تسلیم ہے کیونکہ اس میں ضرور دشواری ہوتی ہے خواہ کتنا ہی سہل قانون ہو۔ مثلاً جو لوگ کہ عدالت میں نوکر ہیں اور ان کا وقت دس بجے سے ہے تو کیا کبھی یہ پابندی دشوار نہیں ہوتی۔ ضرور ہوتی ہے اور اس وقت کہتے ہیں کہ نوکری بڑی ذلت کی چیز ہے مگر اتنی ہی بات پر اس کو کبھی نہ چھوڑ دیا۔ تو جب قانون کی پابندی ہوگی اس میں دشواری ضرور ہوگی تو اگر اسلام میں یہ دشواری ہے تو تسلیم ہے بلکہ اس کو تو خود ہی ثابت کرتے ہیں لا تتبعوا الھویٰ اور اس سے صاف انھا لکبیرۃ الا علی الخاشعین۔

غرض یہ دشواری تو تسلیم ہے مگر اس میں اسلام کی کیا تخصیص ہے تو سبھی کام میں بلکہ کھانے میں بھی ہے۔ کوئی اپاہجوں سے پوچھے خاص کر واجد علی شاہ کے احدیوں سے کہ کھانا کتنا مشکل کام ہے۔

ایک حکایت

مشہور ہے کہ واجد علی شاہ کے یہاں دو احدی تھے ان میں باری اس طرح تھی کہ ایک لیٹا ہوا آرام کرے دوسرا بیٹھا ہوا اس کی حفاظت کرے اسی طرح ایک لیٹا ہوا تھا ایک بیٹھا ہوا، ایک سوار ادھر سے گذرا۔ لیٹے ہوئے نے پکارا کہ میاں سوار ذرا یہ بیر جو میرے سینہ پر رکھا ہے میرے منہ میں ڈال دو۔ اس کو آرام طلبی سے سخت

حیرت ہوئی۔ اور اس سے زیادہ حیرت یہ ہوئی کہ اس کا رفیق جو پاس بیٹھا ہے اس سے اتنا کام نہیں ہوتا۔ اس لئے اس بیٹھے ہوئے سے کہا کہ بھائی تو ہی اس کے منہ میں ڈال دے۔ وہ بہت بگڑا اور کہنے لگا کہ جناب میری آپ کی لڑائی ہوجائے گی۔ آپ کو کیا خبر یہ میرے ساتھ کیسا ہے۔ کل میں لیٹا تھا یہ بیٹھا تھا مجھ کو جو جمائی آئی اس سے منہ کھل گیا۔ ایک کتا آکر منہ میں موتنے لگا، یہ بیٹھا ہوا دیکھتا رہا اور اس سے اتنا نہ ہوا کہ کتے کو ہٹا دے، میں ضرور اس کے منہ میں بیر دوں گا۔ یہ سوار حیرت میں غرق ہوگیا اور لاحول پڑھتا ہوا چل دیا۔

تو حضرت اگر کوئی احدیوں سے پوچھے تو ان کو کھانا بھی مشکل ہے۔ ہمارے عزیز دو بھائی ہیں ایک چھوٹے ایک بڑے۔ بڑے صاحب ہاتھ پاؤں لپیٹ کر بیٹھ جاتے ہیں اور چھوٹے سے کہتے ہیں کہ میرے منہ میں لقمے دے کر مجھ کو کھانا کھلا۔

دشواریوں کی قسمیں

تو ایسی نظیریں بھی موجود ہیں اور رہیں گی تو اس طرح تو کھانے میں بھی دشواری ہے اور اس میں شرعی اور قانونی پابندیاں بھی ہیں مثلاً یہ کہ دوسرے کی چیز نہ کھاؤ اور ڈکیتی نہ ڈالو مگر اس کو کسی نے کہا کہ بڑا سخت قانون ہے۔ وجہ یہ کہ آپ کو ڈکیتی ڈالنا ہی نہیں ہے۔ اس لئے آپ کو اس کی ممانعت کا قانون سخت معلوم نہیں ہوتا۔ اور رشوت لینا مقصود ہے اس لئے اس کی ممانعت سخت معلوم ہوتی ہے لیکن جو ڈکیتی ہمیشہ ہیں ان سے کوئی پوچھے اس ممانعت کے قانون کو کتنا سخت سمجھتے ہیں۔ اسی طرح ایک جماعت بے ہودوں کی ایسی بھی ہے کہ ان کی رائے یہ ہے کہ کوئی سلطنت نہ ہو حالانکہ ضرورت سلطنت کا قانون امر فطری ہے مگر یہ ان کو گراں ہے۔ تو ایسے لوگ تو انسانیت ہی سے خارج ہیں۔ تو محض پابندی سے کوئی بھی بچ نہیں سکتا پھر اسلام ہی پر کون اعتراض ہے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ پابندی کی ضرورت کو تسلیم اور یہ سختی نہیں مگر خود قانون ہی بڑا سخت ہے تو واقعی یہ دشواری ہے مگر دین میں ایسی دشواری ہی نہیں کہ قانون سخت ہو۔

اب یہ شبہ ہوگا کہ یہ تو مشاہدہ کے خلاف ہے تو حقیقت میں اس میں تلبیس ہوئی ہے قانون کی سختی تو وہ ہے کہ اگر اس کو سب بھی مان لیں تب بھی دشواری پیش آوے۔ مثلاً یہ قانون ہوجائے کہ اگر چھٹا تک بھر سے زیادہ کوئی کھاوے تو پھانسی ہوگی۔ یہ ایسی سخت بات ہے کہ اگر سب عمل کرنے کا ارادہ کریں تب بھی کیف ہو۔

اور ایک دشواری اس طرح کی ہے کہ قانون تو نرم ہے۔ اور علامت اس کی یہ ہے کہ اگر

سب اس پر عمل کرنے لگیں تو کسی کو بھی دشواری پیش نہ آوے لیکن اس میں ایک خاص عارض سے سختی پیش آجائے، وہ عارض یہ ہے کہ زیادہ آدمی اس پر عمل نہیں کرتے پس جب تھوڑے آدمی عمل کریں گے تو ان کو دوسروں کی وجہ سے ضرور تنگی ہوگی کیونکہ تعلق معاملات کا ان ہی دوسروں سے ہے۔ تو اس کو قانون کی سختی نہ کہیں گے بلکہ اس سختی کا منشا ان باغیوں کی بغاوت ہے۔

ایک مثال

مثلاً کوئی ایسی جگہ پہونچے کہ وہاں کے لوگ باغی ہوں اور یہ شخص وہاں پہونچ کر کوئی چیز خریدے اور دام دیدے پھر اس سے کہا جائے کہ قانون سلطنت یہ ہے کہ پورے دام لے کر پوری چیز دے دو مگر ہم اس قانون کو نہیں مانتے اسلئے تم کو آدھی چیز ملے گی۔ تو ایمان سے کہئے کہ یہ دشواری قانون کی ہے یا ان بدمعاشوں کی بدمعاشی۔ قانون کا منشا تو یہ ہے کہ سیر بھر کی سیر بھر دو مگر ان بدمعاش لوگوں نے بدمعاشی کی اور سیر بھر کی آدھ سیر دی۔ تو اس دشواری سے اگر کوئی گورنمنٹ کو برا کہنے لگے تو وہ احمق ہے یا نہیں۔ تو جو دشواری اس وقت پیش آرہی ہے وہ دشواری یہ ہے جس کو اسلام پر تھوپا جاتا ہے۔ کوئی شخص اسلام کا کوئی ایسا قانون بتلائے کہ سب مسلمانوں کے مان لینے اور عمل کرنے کے بعد بھی اس میں دشواری پیش آوے۔ اگر پچاس قباحتیں بھی آجادیں جب بھی شریعت کا کوئی ایک قانون بھی ایسا نہیں بتلاسکتے۔ صرف موجودہ دشواری کی وجہ یہ ہے کہ نافرمانیوں سے سابقہ پڑ رہا ہے۔

مثلاً قرض کی ضرورت ہوئی اب جس کے پاس جاتے ہیں وہ کہتا ہے کہ سود لاؤ۔ تو سود کی حرمت کا الزام شریعت پر دینا اور اپنے کئے کا اسلام پر تھوپنا ایسا ہے کہ ؎

حملہ برخود می کنی اے سادہ مرد ؛ ہمچوں آں شیرے کہ برخود حملہ کرد

مثنوی میں شیر کی ایک لمبی چوڑی حکایت لکھی ہے کہ ایک شیر کو ایک خرگوش نے دھوکا دیا اور کہا کہ میں تمہارے راتب کیلئے ایک موٹا خرگوش لاتا تھا راستہ میں ایک دوسرا شیر ملا اور مجھ سے چھین لیا شیر کو غصہ آیا کہ بتلاوہ کہاں ہے اس نے ایک کنویں پر لے جاکر کھڑا کر دیا۔ واقعی اس میں شیر کا عکس نظر آیا بس شیر اس کنویں میں جا کودا۔ اندر پہونچ کر معلوم ہوا کہ میں نے اپنے ہی اوپر حملہ کیا تھا مولانا اس کو فرماتے ہیں ؎

حملہ برخود می کنی اے سادہ مرد ؛ ہمچوں آں شیرے کہ برخود حملہ کرد

اسی طرح ہم کو بھی اپنی دشواری کی صورت شریعت میں نظر آتی ہے مگر حقیقت میں یہ اپنے اوپر اعتراض ہے۔

اس پر ایک حکایت اور یاد آئی کہ ایک حبشی نے آئینہ دیکھا۔ اس میں اپنی صورت نظر پڑی آئینہ کو بڑے زور سے پتھر پر کھینچ مارا کہ ایسا ہی بدشکل تھا تب ہی تو کوئی تجھ کو راستہ میں پھینک گیا۔

ایک اور احمق کی حکایت ہے کہ اس کا بچہ روٹی کھا رہا تھا لوٹے میں ایک ٹکڑا گر پڑا جھانکنے سے اپنی صورت نظر آئی سمجھا کہ اس میں کوئی بچہ ہے باپ سے کہا۔ ابا اس نے یہ میرا ٹکڑا لے لیا۔ آپ چھینئے اٹھے جھانک کر دیکھا تو اپنی شکل نظر پڑی۔ بولے کہ لعنت ہو خدا کی بڈھا ہو کر بچہ کا ٹکڑا چھین لیا۔ تف ہے تیری اوقات پر۔ سو وہ تف کس کو کہہ رہے تھے۔

اسی طرح ہم لوگوں نے آئینۂ شریعت میں اپنی شکل کو دیکھا۔ اور وہ تنگی اپنی صفت تھی اس کو شریعت کی تنگی سمجھا۔ حضرت یہ ہے حقیقت سختی کی۔ اور میں ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ ایک طبیب علاج کر رہا ہے اور بہت شفیق بھی ہے مگر نہ ایسا آزاد کہ خاک پتھر سب کی اجازت دیدے۔ ظاہر ہے کہ جب غذائیں کھائی جاویں گی تو کسی چیز کی تو ضرور ہی ممانعت ہوگی اتفاق سے ایک دیہاتی پہونچا۔ کہ صاحب کھاؤں کیا۔ جواب دیا کہ بکری کا گوشت پالک، وہ بولا یہ تو ملتا نہیں۔ کہا مونگ کی دال۔ کہا یہ بھی نہیں ملتا۔ کہا فیرینی۔ کہنے لگا یہ بھی نہیں۔ پھر خود پوچھا بینگن کھالوں۔ کہا ہرگز نہیں کھانا۔ کریلا کو پوچھا اس کو بھی منع کر دیا آلو سے بھی روک دیا۔ تو دیہاتی نے کہا کہ صاحب ہمارے یہاں تو یہی چیزیں ملتی ہیں۔ طبیب نے کہا کہ فتویٰ طب کا یہی ہے۔ دیہاتی نے باہر آکر کہا کہ صاحب یہ تو بڑے سخت ہیں کہ یہ بھی نہ کھاؤ وہ بھی نہ کھاؤ۔

تو کیا طبیب پر یہ الزام صحیح ہے یا یہ کہا جاوے گا کہ وسعت تو یہ ہے کہ متعدد چیزوں سب کی اجازت دے دی لیکن وہ مقام ایسا کور وہ ہے کہ بجز مضر چیزوں کے وہاں کچھ ملتا ہی نہیں تو یہ طب کی تنگی تو نہیں اس شخص کے گاؤں والوں کی معاشرت کی تنگی ہے۔

اسی طرح حاجت ضروریہ پر نظر کر کے دیکھئے کہ معاش کی ضروری سبیلوں کو جو کہ قریب الوقوع ہیں اگر پچیس آپ نکالیں گے تو بیس کو شریعت تجویز کہے گی اور پانچ کو لا یجوز لیکن آپ کے ملک والے ہمیشہ ان ہی پانچ کو استعمال کریں اور بیس کو متروک کر دیں تو تنگی معاشرت کی ہوئی یا قانونِ شریعت کی۔ پس یہ الزام تو بحمد للہ بوجہ احسن و اکمل رفع ہو گیا۔ اور اگر اس کی تصدیق میں شبہہ ہو تو علم دین پر رہیئے اس سے معلوم ہوگا کہ

شریعت نے ابواب معاش میں کس قدر توسیع کی ہے۔

ایک اشکال اور اس کا حل

اب صرف ایک فریاد رہ گئی ہے اس میں جی چاہتا ہے مسلمانوں کی ہمدردی کرنے کو۔ وہ یہ ہے کہ یہ تو سمجھ میں آگیا کہ شریعت میں تو دشواری نہیں مگر حالت موجود ہیں اس عارض کے سبب کہ ہم کو سابقہ ایسوں سے پڑا ہے جو شریعت پر عمل نہیں کرتے۔ عارضی دشواری تو ہوگی۔ تو ہم پر تو دشواری کا اثر آخر پہونچ گیا البتہ اعتقاد درست ہو گیا کہ شریعت میں دشواری نہیں مگر عمل کس طرح سے کریں کیا لین دین چھوڑ دیں۔ کیونکہ نوکریاں اکثر ناجائز معاملات اکثر ناجائز تجارت اکثر ناجائز تو یہ ایک فریاد قابل استماع ہے تو اس کے متعلق بھی سن لیجئے۔

اس میں قدرے تفصیل ہے وہ یہ کہ آپ نے جو چند معاملات کو دیکھ کر اس عارضی دشواری کے اعتبار سے عام حکم کر دیا کہ سب ہی دشوار ہے۔ غیر مسلم ہے۔ سمجھئے کہ ایسے اعمال دو قسم کے ہیں ایک وہ کہ ان کی اصلاح کرنے سے معاش کی گاڑی کچھ اٹکتی ہے اور ایک وہ کہ ان کی اصلاح سے معاش کا کچھ بھی نقصان نہیں مثلاً وضع شریعت کے موافق بنائے نماز روزہ کرے۔ تکبر نہ کرے باجا گاجا چھوڑ دے تو بتلائیے اس میں معاش کا کیا نقصان ہے؟ تو آج ہی سے اصلاح کر لیجئے پس زیادہ اعمال تو آپ کے آج ہی سے درست ہو جاویں گے کیونکہ پچاس عمل میں چالیس ایسے نکلیں گے کہ محض گناہ بے لذت ہیں کہ خواہ مخواہ آپ نے انکو اپنے پیچھے لگا رکھا ہے۔ آگے دس ہی رہ جاویں گے اس میں اگر آپ کی اصلاح نہ بھی ہوئی تو چونکہ غالب درجہ اعمال صالحہ کا موجود ہو چکا ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ سے امید ہے کہ بقیہ اعمال کو جو کہ مغلوب و قلیل ہیں درست فرما دیں گے۔ جیسے ایک شعلۂ جوالہ کے دیکھنے میں پورا دائرہ شعلہ نظر آتا ہے حالانکہ اس میں بہت چھوٹی قوس نورانی ہے اور بڑی قوس ظلمانی مگر جب نور و ظلمت جمع ہوتے ہیں تو نور ہی غالب آتا ہے اور اس درستی میں گویا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی خاصیت ہی یہی ہے جیسے مقناطیس کہ بالخاصہ جاذب حدید[1] ہے پس اگر ہم یہ کہیں کہ اعمال صالحہ میں بھی خاصیت یہی ہے کہ بقیہ اعمال کو درست کر دیتا ہے تو اس کا دعویٰ ہو سکتا ہے مگر میں اس کا راز بھی بتلاتا ہوں کہ اعمال صالحہ میں ایک اثر ہے کہ اس سے قلب میں قوت ہوتی ہے اور صحابہ کی ترقی کا راز یہی ہے ہم نے بزرگوں کو دیکھا ہے کہ بیماری میں اٹھا نہیں

---

[1] حدید۔ لوہا

جاتا مگر نماز کے وقت بلا تکلف کھڑے ہوکر نماز ادا کر لیتے ہیں۔ خوب کہا ہے ؎

ہر چند کہ پیر خستہ دبس ناتواں شدم ہر گہ نظر بروئے تو کردم جواں شدم

بندگی سے قوت آتی ہے

ان کی خدمت میں جب جی چاہے جاکر دیکھ لیجئے غرض طاعت سے قوت ہوتی ہے اور اصلاح نہ کرنے کا صرف یہی سبب تھا کہ ہمت نہیں ہوتی تھی مگر جب قوت ہوگی تو تمام موانع مضمحل ہو جاویں گے اور اگر کوئی اس ڈر سے کہ کبھی اصلاح ہو جاوے یہ تدبیر بھی نہ کرے تو دوسری بات ہے جیسے کسی نے یہ سن کر کہ چاند دیکھنے سے روزہ فرض ہو جاتا ہے کہا تھا کہ ہم چاند ہی نہ دیکھیں۔ غرض اس طرح قوت پیدا ہو جاتی ہے اور ضعف جاتا رہتا ہے۔

یہ ہے وہ راز اور اگر بالفرض اصلاح بھی ہوئی تو ایک اور بات تو ضرور پیدا ہو جاوے گی کہ اس معصیت کی مذمت آپ کے قلب میں جمتی چلی جاوے گی اور اس سے نفرت پیدا ہو جاویگی اور یہ مذمت و نفرت آپ کی اصلاح کر دے گی اور آخری بات یہ ہے کہ اگر اس طرح بھی اصلاح نہ ہوئی تو جرائم تو گھٹ گئے اگر ایک شخص پر چار جرم قائم ہوئے اور وکیل نے کہا کہ تین تو ٹل سکتے ہیں مگر ایک نہیں ٹل سکتا۔ تو کیا کوئی یہ کہے گا۔

"کہ چوں آب از سر گذشت چہ یک نیزہ، چہ یک دست"

ہرگز نہیں بلکہ تخفیف ہی کو غنیمت سمجھیں گے۔ تو اس طرح آپ بھی پچاس جرائم میں سے صرف دس ہی کے مجرم رہ گئے۔

اب وہ حصہ رہ گیا جس میں تغیر کرنے سے معاش کا حرج ہے تو اول تو چونکہ آپکو شریعت کے احکام نہیں معلوم ہیں اس وجہ سے بہت سے افعال ناجائز صادر ہو جاتے ہیں اگر آپ احکام کی تحقیق کیجئے گا تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تھوڑے تغیر سے وہ جائز ہو جاوے گا۔

چاندی کا مسئلہ

مثلاً اگر آپ نے چاندی خریدی تو اس میں مسئلہ یہ ہے۔ کہ چاندی کا مقابلہ اگر چاندی سے ہو تو زیادتی کمی حرام ہے۔ اگر اب کہئے کہ صاحب اچھا مسئلہ سنا کر نرخ کے حساب سے تو سو روپیہ کی چاندی ایک سو بیس بھر آتی مگر اب سو روپئے کی سو ہی روپئے بھر ملی۔ اچھا عمل کیا کہ بیس روپئے کا خسارہ ہوا۔ اب ساری عمر کیلئے مولویوں کو خیر باد کہدیں گے۔

تو سنئے بات یہ ہے کہ اگر مولوی صاحب سے یوں پوچھتے کہ مولوی صاحب جب چاندی

میں زیادتی حرام ہے تو اب اگر اس پر اس خاص صورت میں عمل کریں تو بڑا نقصان ہوگا کیا کوئی جائز شکل بھی معاملہ کی ہے تو مولوی صاحب یوں کہتے کہ ان روپیوں میں ایک گنی بھی ملا لو تو ایک سو بیس بھر چاندی جو آوے گی تو پچاس روپئے بھر تو پچاس روپئے کی آوے گی اور باقی کی اس گنی میں شریعت محسوب کرے گی۔ تم کو نیت کرنے کی بھی ضرورت نہیں شریعت خود فیصلہ کر چکی ہے۔ تو اب بتلائیے کیا نقصان ہوا اب مشکل تو یہ ہے کہ علماء سے پوچھتے بھی نہیں۔

صاحبو! پوچھتے رہو، اور میں یہ تو نہیں کہتا کہ سب کو مولوی صاحب جائز ہی کہدیں گے۔ کیونکہ شریعت ان کے گھر کی تو ہے نہیں کہ وہ اپنے اختیار سے جسے چاہیں جائز کر دیں جیسا کہ ایک مطوف سے ایک بڑھیا نے صفا مروہ کی سعی میں تھک کر کہا تھا کہ مولوی صاحب اب تو معاف کردو۔

علماء ہند

اسی طرح بعضے لوگ یوں چاہتے ہیں کہ علماء ہند مثل بعض علماء مصر کے کرنے لگیں ان بعض علماء نے ایسا کر رکھا ہے کہ جو دنیا میں ہو رہا ہے سب جائز ہے۔ تو یہاں کے لوگ بھی یہی کرانا چاہتے ہیں علماء سے جیسے ایک رئیس نے ایک نوکر سے یہ کام لیا تھا کہ جو ہماری زبان سے نکلے تم اس کی تصدیق کر کے توجیہہ کر دیا کرو۔ چنانچہ ایک بار اس رئیس کے منہ سے کہ ہم شکار کو گئے ایک ہرن پر گولی چلائی وہ اس کے سم کو توڑ کر ماتھے کو پھوڑ کر نکل گئی۔ سب اہل مجلس ہنسنے لگے کہ سم اور ماتھے کا کیا جوڑ۔ نوکر بولا سچ ہے حضور، وہ اس وقت سم سے پیشانی کھجلا رہا تھا۔

تو حضور علماء سے تو ایسی نوکری ہوتی نہیں۔ نہ ہم اتنے ذہین ہیں اور نہ خدا کرے کہ ہوں۔ تو حاصل یہ کہ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ سب کو جائز کہدیں۔ مگر پوچھ کر دیکھو تو بہت سے اشکالات کا جواب مل جاوے گا۔ تو بہت بڑا حصہ اس عارضی دشواری کا اس طرح ختم ہو جاوے گا۔

ہاں بعض امور پھر بھی ایسے رہ جاویں گے کہ وہ بالکل ناجائز ہوں گے مگر اس میں بھی دو درجے ہیں ایک تو وہ کہ اس کو چھوڑ کر دوسرے کام میں لگ سکتے ہیں پس اسکو تو چھوڑ دیا جاوے۔ کیونکہ اس کا چھوڑنا مضر حوائج ضروریہ نہیں۔ اور ایک وہ درجہ ہے کہ اس کو چھوڑ نہیں سکتے کیونکہ دوسرے کام اس کے حوائج ضروریہ کو کافی نہیں۔ تو بادل ناخواستہ اس کو کرتے رہو اور گو یہ جائز تو نہ ہوں گے مگر اس کے متعلق ایک دستور العمل ایسا بتلاتا ہوں کہ اس سے ایسے جرائم خفیف ہو جاویں گے۔ اور یہ کہ اس میں دو برتاؤ کرنا چاہئیں ایک تو یہ کہ ہر روز توبہ کیا کرے۔ اب تو یہ غضب ہے کہ لوگ توبہ کی حقیقت نہیں سمجھتے۔ توبہ کی حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ کیا اس پر پچھتائیے اور دعا کیجئے کہ

اے اللہ مجھے معاف فرمائیے مواخذہ نہ کیجئے۔

تو یہ کیوں نہیں کرتے کیا ایسا کرنے سے نوکری سے موقوف ہوجاؤگے۔ ہرگز نہیں بلکہ بلکہ تم نوکر ہی رہوگے۔ دوسرے یہ دعا کیا کرو کہ اے اللہ کوئی دوسری سبیل نہ نکلی تو یہ شخص شرمندہ گنہگاروں کی فہرست میں تو لکھا جاوے گا جرمی گنہگاروں کی فہرست میں نہیں لکھا جاوے گا۔

اور یہ توسع آپ میری ہی زبان سے سنیں گے اور توسیع میں راز شرعی یہ ہے کہ اگر چھوڑنے پر مجبور کیا جاوے تو شاید اس کو چھوڑ کر اس سے بھی زیادہ کسی گناہ شدید میں مبتلا ہوجاوے مثلاً یہی کہ چلو آریہ بنیں تو یہ توسع "ایں بلا دفع بلا ہائے بزرگ" کا مصداق ہے اور میں کفر سے بچا رہا ہوں کیونکہ جب آدمی نادار ہوتا ہے تو خدا جانے کیا کیا اسکو سوجھتا ہے۔

ایک واقعہ

ہمارے حضرت حاجی صاحب جب تھانہ بھون میں رہتے تھے ایک پٹھان حضرت کی خدمت میں دعا کرانے آیا کرتے تھے کہ مجھ پر ایک شخص نے جائداد کے معاملہ میں بڑا ظلم کر رکھا ہے۔ حضرت دعا فرما دیتے۔ ایک بار آکر کہنے لگے کہ اب تو اس نے حد ہی کردی اور جائداد غصب ہی کرنے کو ہے۔ حضرت نے فرمایا بھائی صبر کرو۔ اس نے کہا بہت اچھا دفعتہً حافظ محمد ضامن صاحب حجرہ میں سے نکل آئے اور اس پٹھان سے فرمایا۔ ہرگز مت صبر کرنا جاؤ نالش کردو اور ہم دعا کریں گے۔ اور حضرت سے فرمایا آپ تو صابر شاکر تھے سب چھوڑ کر بیٹھ رہے اس میں تو اتنی قوت نہیں یہ اگر اسباب معاش کو چھوڑ دے گا تو جب حاجت ستائے گی یہ جھوٹی گواہی دے گا۔ چوری کرے گا تو ایسوں کو صبر نہیں کرایا کرتے۔

تو یہ ہے اصل راز اس توسع کا۔ تو آپ کسی سے اتنی گنجائش نہ بنیں گے مگر یہ اسلئے ظاہر کردیا گیا کہ کفر سے بچانا ہے۔ لیکن خدا کے لئے اس کو آپ تمام معاصی میں آڑ نہ بنا لیں کہ یہ جز تو بہت اچھا ہاتھ آیا۔

بات یہ ہے کہ اول تو یہ بہت تھوڑا حصہ ہے سب معاصی میں اس کا توڑ یہ نہیں ہوسکتا۔ دوسرے اس میں یہ بھی قید لگی ہوئی ہے کہ اس سے نکلنے کی ہر وقت فکر کرتے رہو جیسے کوئی پاخانہ میں بیٹھا ہوا ہو اور تقاضا نکلنے کا رہتا ہے۔

ایک رئیس کا قصہ

اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک رئیس صاحب ریل میں بیٹھے ہوئے تھے اور کہیں جگہ نہ تھی مگر انھوں نے کئی آدمیوں کی جگہ گھیر رکھی تھی اور کوئی کچھ کہتا تو دھمکاتے۔ آخر ضرورت سے پائخانہ میں گئے تو چٹخنی لگ گئی اور ان کے کھولنے

سے نہ کھلی بڑے پریشان ہوئے لوگوں سے التجا کی سب نے انکار کردیا۔ آخر بڑی سماجت کے بعد لوگوں نے دوسروں کو تنگ نہ کرنے کی قسم کھلائی یہ بھی نہ دیکھا کہ یہ پائخانہ میں ہے اس میں قسم کھلانا جائز نہیں ہے تو جس طرح وہ پائخانہ سے نکلنے کی کوشش کررہا تھا اسی طرح حرام نوکری میں ایسے ہی رہو کیا کوئی پائخانہ میں جاکر فخر کرتا ہے۔ بلکہ قید سمجھتے ہیں مگر مجبوری میں کیا کریں۔ بس اس کی یہ حالت ہوگی ؎

چونکہ برمیخت بہ بند و بستہ باش ∴ چوں کشاید چابک و برجستہ باش

انسانی کوشش

تو نکلنے کی فکر کرو۔ کوشش تو کرو، گو کچھ امید نہ بھی ہو اسی کو فرماتے ہیں ؎

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید ∴ خیرہ یوسف وار می باید دوید

یوسف علیہ السلام کا قصہ ہوا کہ جب زلیخا نے دروازہ بند اور مقفل کرلیا اور آپ نکلنے کیلئے دوڑے ہیں۔ عجیب توکل اور ہمت تھی کہ باوجود قفل لگے رہنے کے دوڑے اور آخر قفل ٹوٹ کر سب دروازے کھل گئے۔ اس کو فرماتے ہیں۔

گرچہ رخنہ نیست عالم راپدید ∴ خیرہ یوسف وار می باید دوید

اور اگر نہ بھی کھلے گا تو حق تعالیٰ یہ تو دیکھیں گے کہ یہ تو دوڑا کر بھی لگ گئی اتنے پر بھی فضل ہوجاوئے گا۔

اب بتلائیے اس میں کون سی چیز مشکل ہے میں تو نوکری نہیں چھڑاتا۔ مگر نفور رہیں۔ سو یہ کیا مشکل ہے اب تو یہ بھی نہیں بلکہ معصیت پر ناز ہے۔ بیباکی ہے۔ سو یہ فخر کیسا۔ اور تکبر کیسا۔ اور اہل دین کو ذلیل کیوں کہا جاتا ہے۔ سو اہل اسباب کا علماء کے ساتھ بڑا اختلاف معاش کے باب میں تھا۔ مگر اس سے زیادہ معاش کے متعلق کیا گنجائش ہوسکتی ہے۔

تو اب کونسا مرتبہ اختلاف کا رہ گیا نرا قانون تو دشوار ہے نہیں اور قانون سخت نہیں۔ صرف بات یہ تھی کہ لوگوں کی طرف سے دشواری ہوجاتی ہے۔ تو اس میں بہت بڑی فہرست اصلاح کی تو معاش میں مخل ہی نہیں اور جو مخل ہے اس کا بڑا حصہ تدبیر سے جائز ہوسکتا ہے اور جو تدبیر سے بھی جائز نہ ہوسکے وہ اولاً بہت مختصر ثانیاً اس میں اس طرح رہنے کی اجازت کہ اس سے نکلنے کی کوشش اور کیئے پر پچھتانا اور توبہ کرتے رہنا تو اب وہ کون سا جزو ہے جس پر یہ اشکال ہے کہ شریعت کی پابندی بہت سخت ہے۔ تو بحمد اللہ بے غبار یہ ثابت ہوگیا کہ وما جعل اللہ علیکم

فی الدین من حرج ، (الآیہ) (نفی الحرج صہ ۱۸)

(۱۴) ہر بات کی دلیل قرآن شریف سے طلب کرنا غلطی ہے

دلائل شرعیہ چار ہیں۔ کتاب، سنت، اجماع، قیاس۔ جو امر ان دلائل چہارگانہ میں سے کسی ایک سے بھی ثابت ہو وہ دین میں معتبر ہوگا ورنہ رد ہے۔ پس یہ بھی غلطی ہوگی کہ ان چاروں سے تجاوز کیا جاوے۔

ایک عام غلطی

آج کل ایک عام غلطی یہ بھی ہو رہی ہے کہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ مسئلے کو قرآن شریف سے ثابت کریں، حالانکہ دلائل شریعت کے چار ہیں اگر ان میں سے ایک سے بھی کوئی مسئلہ ثابت ہو جائے گا تو وہ شرعاً ثابت ہو جائے گا۔ چنانچہ ڈاڑھی رکھنے کی نسبت بعضے کہتے ہیں کہ قرآن شریف سے دلیل لاؤ کہ ڈاڑھی رکھنا فرض ہے۔ اور یہ دلائل کا مطالبہ کرنے والے ایسے حضرات ہیں کہ جن کو خود تحقیق و استدلال ہی سے اصلاً مس نہیں ان کو تو چاہیئے تھا کہ محض تقلید کرتے۔ علماء کی۔ قاعدہ عقلی ہے کہ جس فن کا جو جاننے والا ہوتا ہے وہی اس میں دخل دے سکتا ہے اور نہ جاننے والا اگر دخل دے تو اس کو سب ہنستے ہیں۔ یہ قاعدہ ہر جگہ تو جاری کرتے ہیں لیکن دین کے اندر ہر شخص مجتہد ہونے کا مدعی ہے اور ہر کس و ناکس اس میں دخل دینے کے لئے تیار ہے۔ فن زراعت کو مثلاً میں نہیں جانتا۔ تو اگر میں گیہوں بونے کا طریقہ بیان کروں تو جاننے والے یہ کہیں گے کہ تم کیا جانو۔ اور تمام عقلاء کے نزدیک جواب کافی سمجھا جائے گا مگر حیرت ہے کہ دین کے بارے میں اگر علماء بعینہ یہی جواب دیتے ہیں تو ناکافی شمار ہوتا ہے۔

ایک مثال

یاد رکھو فن کے جاننے والوں کے سامنے تمہارے مطالبۂ دلائل کی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص کے پاس گھڑی ہے اور وہ بڑی معتبر ہے۔ تار گھر سے ملی ہوئی ہے اور ایک شخص آفتاب کی طرف رخ کئے ہوئے کھڑا ہے۔ گھڑی والا کہتا ہے کہ گھڑی کے اعتبار سے آفتاب چھپ گیا اور اس میں ہرگز غلطی کا احتمال نہیں۔ دوسرا شخص کو دیکھنے والا کہتا ہے کہ آفتاب

میرے سامنے ہے چھپا نہیں اور گھڑی والا اس سے دلیل طلب کرتا ہے اور وہ ہنستا ہے کہ یہ تو کھلی بات ہے۔ آفتاب نظر کے سامنے ہے تم اس طرف منہ کر کے دیکھو۔ آفتاب موجود ہے۔ دلیل کی حاجت نہیں ہے۔

پس جن لوگوں نے دین کے باب میں اپنی عمریں کھپا دی ہیں ان کا قول معتبر ہوگا یا ایک لڑکے کا جو آج ہی بالغ ہوا ہے۔ لیکن دین کا بالغ نہیں ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

خلق اطفال اند جز مست خدا ∴ نیست بالغ جز رہیدہ از ہوا

بہرحال حسًا بالغ ہو یا نہ ہو، روحًا بالغ نہیں ہے۔ بلکہ حسًا بھی ہم کو تو ایسے لوگ بالغ نہیں معلوم ہوتے اس لئے کہ ظاہری علامت بلوغ کی ڈاڑھی تھی اور وہی صفاچٹ ہے۔ معلوم بھی نہیں ہوتی کہ نکلی ہے یا نہیں۔

شریعت کے دلائل

بہرحال ایسے لوگ جن کی یہ حالت ہے کہ علوم دین کی ان کو ہوا تک نہیں لگی وہ دلائل کا مطالبہ کرتے ہیں کہ قرآن شریف سے دلیل لاؤ۔ میں کہتا ہوں کہ اس سوال کے اندر ایک دعویٰ مضمر ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ وہ اس کے مدعی ہیں کہ شریعت میں قرآن شریف کے سوا کوئی دلیل نہیں۔ ہے ہم اس دعویٰ پر اول ان سے دلیل کا مطالبہ کرتے ہیں ہم کو یہ سمجھا دو کہ شریعت میں قرآن شریف ہی دلیل ہے اور کوئی دلیل نہیں۔ خود قرآن شریف سے ثابت ہے کہ علاوہ قرآن شریف کے اور بھی دلائل ہیں۔ فرماتے ہیں۔ وَمَا آتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰکُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۔ (جو رسول خدا تم کو دیں اسے لے لو اور جس سے روکیں ان سے رک جاؤ)

حدیث رسول ﷺ

اس سے صاف معلوم ہوا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد اگرچہ وہ قرآن نہ ہو مثل قرآن شریف کے حجت ہے اور کیوں نہ ہو وما ینطق عن الھویٰ آپ کی شان ہے ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود ∴ گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

اجماع امت

اور فرماتے ہیں وَمَنْ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَیَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۔ اس آیت شریف سے اجماع امت کا حجت ہونا معلوم ہوا۔

قیاس

اور فرماتے ہیں وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ

اور فرماتے ہیں فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِى الْاَبْصَارِ ، یہ آیتیں بتلارہی ہیں کہ قیاس بھی حجت ہے۔

پس اگر آپ قرآن شریف کو حجت مطلقہ مانتے ہیں تو اس کی کیا وجہ ہے کہ اس کے بعض دعاوی مسموع اور حجت اور بعض نامسموع۔ غرض یہ سخت غلطی ہے۔ دیکھئے عدالت میں دعویٰ کی سماعت کے لئے شہادت مطلقہ کی ضرورت ہے۔ مدعی اگر دو باوجاہت آدمیوں کو پیش کردے تو مدعا علیہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ فلاں جج صاحب اور فلاں مولوی صاحب گواہی دیں گے تو مانوں گا اور اگر وہ ایسا کہے تو حاکم ہرگز نہ سنے گا۔ اور یہ کہے گا کہ تم ان گواہوں جرح کرو۔ تو اس کی طرف التفات ہوگا لیکن اگر یہ مجروح نہیں تو تمہاری یہ تخصیص کہ فلاں فلاں اشخاص گواہی دیں ایک لغویات ہوگی۔

صحیح دلیل

اسی طرح مسئلہ عقلیہ ہے کہ دعویٰ کے اثبات کے لئے مطلق دلیل صحیح کی ضرورت ہے مستدل جس دلیل کو چاہے اختیار کرے مخاطب کو یہ اختیار ہے کہ اس میں جرح کرے۔ اس کا جواب بذمہ مدعی ہوگا لیکن وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ تم نے یہ دلیل کیوں اختیار نہ کی۔ اسی طرح یہاں سمجھ لیجئے کہ کسی مسئلہ شرعیہ کے اثبات کیلئے مطلق دلیل صحیح کی ضرورت ہے جو ادلۂ اربعہ میں سے ہو کسی خاص دلیل کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا البتہ اس کا لحاظ ضروری ہے کہ قطعی دعویٰ کیلئے قطعی دلیل اور ظنی دعویٰ کے لئے ظنی دلیل ہونا چاہیئے جس کی تفصیل اپنے مقام پر مذکور ہے۔

غرض ایک تو غلطی یہ ہے اور دوسرے اس کے مقابل یہ ہے کہ ان چاروں سے گذر کر نرے ظن کو ہی حجت سمجھا جائے کہ نرا گمان بھی کسی مسئلہ کا مثبت نہیں ہے بلکہ دلیل صحیح ادلہ اربعہ میں سے ہونا ضروری ہے۔ (حصہ ششم دعوات عبدیت وعظ الغار المجاز رقہ ص۱۲۱)

(۱۵) آزادی کے معنیٰ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے کہ آپ رات کے وقت گشت لگا رہے تھے کہ ایک گھر سے گانے کی آواز آئی۔ آپ نے دروازہ کھلوانا چاہا مگر وہ لوگ اس قدر منہمک تھے کہ آپ کی آواز بھی نہ سن سکے آخر آپ مکان کی پشت پر سے اندر تشریف لے گئے۔ حضرت عمرؓ

کی صورت دیکھ کر وہ سب لوگ سہم گئے لیکن چونکہ جانتے تھے کہ حضرت عمرؓ کو ہرگز غصہ نہ آئے گا اسلئے ایک شخص نے جرأت کر کے عرض کیا کہ اے امیر المومنین ہم لوگوں نے صرف ایک ہی گناہ کیا لیکن آپ نے تین گناہ کئے۔ ایک تو یہ کہ آپ بغیر اجازت ہمارے گھر میں چلے آئے حالانکہ قرآن شریف میں صاف حکم ہے۔ [۱] لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا۔ دوسرا یہ کہ آپ نے تجسس کیا اور قرآن شریف میں تجسس کی ممانعت ہے۔ [۲] لَا تَجَسَّسُوْا۔ تیسرے یہ کہ آپ مکان کی پشت پر سے تشریف لائے حالانکہ قرآن شریف میں ارشاد ہے [۳] لَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں اپنے گناہ سے توبہ کرتا ہوں تم بھی اپنے گناہ سے توبہ کر لو۔

آزادی کا دم بھرنے والوں کو اس حکایت سے عبرت حاصل کرنی چاہیئے کہ آزادی ان حضرات میں تھی یا آج کے مدعیان آزادی میں بہائم کی طرح نہ نماز کے نہ روزے کے۔ کھا لیا اور ہوا پرستی میں عمر گذار دی۔

صاحبو! واللہ یہ آزادی نہیں۔ یہ نفس کی شرارت اور اتباعِ ہوا [۴] اور مطلق العنانی ہے۔ یہ آزادی سانڈ کی سی آزادی ہے کہ جس کھیت میں چاہا منہ مار دیا جدھر چاہا چل دیا جو چاہا کر لیا۔ تو کیا کوئی آزاد صاحب سانڈ صاحب کو پسند کرتے ہیں۔ اگر اس کا جواب نعم [۵] ہے تو آج سے آپ بھی ہماری طرف سے یہی لقب لیجئے، اور اگر لا [۶] میں جواب ہے تو پھر ذرا مہربانی کر کے اپنے اور سانڈ میں کچھ فرق بتائیے۔ (نسیان النفس ص۱۸)

(۱۶) اس اعتراض کا جواب کہ علماء کو لیکچر دینا نہیں آتا

اہل حق اور جدید طرز کے لوگوں کی تقریریں جو فرق میں نے دیکھا وہ یہ ہے کہ جدید طرز کی تقریریں پہلی نظر میں نہایت وقیع اور مؤثر ہوتی ہیں اور حق انھیں میں منحصر معلوم ہوتا ہے لیکن جب ان میں غور کیا جائے تو انکی حقیقت کھلتی جاتی ہے اور ان کا لچر اور کمزور اور خلاف واقع ہونا اور

---

[۱] گھروں میں داخل نہ ہو۔ جو تمہارا گھر نہیں یہاں تک کہ اجازت حاصل کر لو اور گھر والوں کو سلام کر لو
[۲] کسی کے پیچھے ٹوہ میں نہ پڑو [۳] یہ نیکی نہیں ہے کہ تم گھروں میں اس کی پشت کی طرف سے آؤ۔
[۴] خواہشاتِ نفس [۵] ہاں [۶] نہیں۔

پُرتلمیع[1] ہونا معلوم ہوتا جاتا ہے اور اہل حق کی تقریریں نظراول میں بے رنگ اور پھیکی معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن جتنا ان میں غور کیا جائے تو انکی قوت اور مطابق واقع ہونا معلوم ہوجاتا ہے اور قلب پر نہایت گہرا اثر ان کا ہوتا ہے کہ اس کے سامنے تمام تلمیعات قلب سے ڈھل جاتی ہیں۔

یہاں سے اس اعتراض کا جواب بھی نکل آیا جو آج کل کے علماء پر منجملہ دوسرے اعتراضات کے وہ بھی کیا جاتا ہے کہ انکو لیکچر دینا نہیں آتا وہ جواب یہ ہے کہ جب ہمارے پاس قرآن شریف اور حدیث شریف ہے اور اس کی تعلیمات کا سرمایہ موجود ہے تو ہم کو کسی ظاہری آب و تاب کی کیا ضرورت ہے، خوب کہا ہے

زعشق ناتمام ما جمال یار مستغنی ست
بآب ورنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبارا

سادگی

لیکن لیکچروں کا طرز سیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور ہم تو صاف کہتے ہیں کہ جو شخص لیکچر کے طرز کو اختیار کرتا ہے وہ اول ہمارے دل میں ناپسندیدگی کا بیج بوتا ہے ہم کو تو وہی طرز پسند ہے جس کی طرف حدیث شریف میں اشارہ ہے نحن امۃ امیۃ امیۃ کے معنیٰ سادگی کے ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل مرضی یہ ہے کہ آپ کی امت نہایت سادہ رہے۔ اسی لئے آپؐ نے لفظ نحن فرماکر ساری امت کو شامل فرمالیا۔ یہی روح ہے اتباع نبویؐ کی، کہ ہر بات میں بالکل سادگی ہو امیۃ ام کی طرف منسوب ہے مطلب یہ ہے کہ ہماری زندگی ایسی رہے جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کے بعد بچہ کی زندگی ہوتی ہے کہ اس کو کوئی حرکت بھی تصنع اور بناوٹ کی نہیں ہوتی بلکہ ہر حرکت میں بے ساختگی ہوتی ہے۔ اور بچوں کی یہی صفت ہے جس کی وجہ سے ہر شخص کو ان سے محبت ہوتی ہے ورنہ طبعاً بچوں سے جو کہ نجاست کی پوٹ ہوتے ہیں بہت نفرت ہونی چاہیئے تھی اور یہی بے ساختگی ہے کہ جن بوڑھوں میں یہ پائی جاتی ہے آج ہماری آنکھوں کے سامنے بڑے بڑے حسین ان پر جان فدا کرتے ہیں۔ تو اصلی مفہوم امیۃ کا یہی بے ساختگی ہے اور نہ لکھنا پڑھنا جو امیت کا مشہور مفہوم ہے یہ بھی اس کا ایک شعبہ ہے۔

سادگی کے ساتھ صفائی

تو بیان میں بھی بناوٹ اور تکلف بالکل نہ ہونا چاہیئے اور تلبیس اور تلمیع سے بالکل پاک ہونا چاہیئے۔ البتہ بیان

---

[1] ملمع سے بھری ہوئی۔

میں سادگی کے ساتھ صفائی ہونی ضروری ہے۔ لیکن اب یہ طرز بالکل چھوٹتا جاتا ہے ہم اہل علم کو دیکھتے ہیں کہ ان میں ایک تو رواج زبان کا طرز آجاتا ہے۔ حالانکہ قطع نظر شریعت کے یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ ہماری مادری زبان اردو ہے اور اس میں کچھ خصوصیات ہیں جیساکہ ہر زبان کے لئے کچھ خصوصیات ہوا کرتی ہیں۔ اب اس طرز جدید کو اختیار کرکے انگریزی کی خصوصیات کو زبان اُردو میں لے لیا گیا ہے اور وہ روز بروز زیادتی کے ساتھ آتی جاتی ہیں حالانکہ انگریزی کی خصوصیات اس میں بالکل نہیں کھپتی۔

اُردو زبان کی خصوصیت

ان کی بدولت زبان بالکل بھدّی اور خراب ہوتی جاتی ہے۔ ایسے لوگوں میں اس وقت ایک بڑی جماعت اپنے کو اردو کا حامی کہتی ہے۔ حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ لوگ اردو کے حامی نہیں کیونکہ ہر زبان میں ایک مادہ ہوتا ہے اور ہیئت۔ اور زبان ان دونوں کے مجموعے کا نام ہوتا ہے نہ کہ صرف مادہ کا۔ تو جب زبان اردو کی ہیئت باقی نہ رہے گی تو وہ زبان اردو کیونکر رہے گی پس اگر ہم اُردو کے حامی ہیں تو ہم کو چاہیئے کہ ہم اس کی خصوصیات کو باقی رکھیں۔ اور ہماری گفتگو ایسی ہو کہ اگر کوئی اجنبی سنے تو یہ سمجھے کہ ہم ایک حرف بھی انگریزی کا نہیں جانتے اور نہ انگریزی طرز سے ہم کو مناسبت ہے اور اس سے بھی بڑا تعجب یہ ہے کہ اس وقت عربی طلبہ کی تقریروں میں کثرت سے انگریزی الفاظ آنے لگے ہیں حالانکہ ان کی تقریر میں اگر دوسری زبان کے الفاظ آتے تو عربی کے الفاظ آتے۔ کیونکہ اول تو یہ لوگ عربی زبان کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ دوسرے عربی ہماری مذہبی زبان ہے اور اس اعتبار سے ان کی اصلی زبان وہی ہے اور اردو زبان تو بہت تھوڑے دنوں سے ہماری زبان ہوئی ہے ورنہ ہماری اصلی زبان اور پدری زبان عربی ہی ہے کیونکہ ہمارے آباء و اجداد عرب ہی سے آئے ہیں اور ہندوستان میں بود و باش اختیار کرلی ہے۔

اصل اُردو

غرض جب ہماری اصلی زبان عربی ہے تو اگر ہم کو اردو میں آمیزش ہی کرنا تھا تو اس بناء پر زیادہ سے زیادہ ہم یہ کرتے کہ اردو زبان کو عربی کے تابع کردیتے۔ مگر تعجب یہ ہے کہ ہم نے انگریزی کے تابع کیا کہ جس کی بدولت اردو زبان قریب قریب اُردو ہونے ہی سے نکل گئی۔ اصل زبان اردو وہ ہے جیسے چہار درویش یا اردوئے معلیٰ غالب کی۔ اگر اس میں آمیزش ہو تو عربی کی آمیزش ہونا چاہیئے۔ کہ عربی کی آمیزش لطف کو

دوبالا کردیتی ہے۔ دیکھو فارسی کی عبارت میں اگر کہیں ایک جملہ عربی کا آجاتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے گلفشانی ہوگئی ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہماری زبان میں جو انگریزی کے خلط سے ایک جدت پیدا ہوگئی ہے وہ ضرور قابل ترک ہے اور اس جدید طرز میں علاوہ نقص مذکور کے ایک بڑا عیب یہ بھی ہے کہ تلبیس زیادہ ہوسکتی ہے اور پرانے طرز میں یہ بات نہیں ہے۔ اور ایک شرعی پہلو اس میں یہ بھی ہے کہ اس کو اختیار کرنا ایک فاسق قوم کے مشابہ ہے اور یہ مشابہت خود حرام ہے حدیث میں ہے۔ من تشبہ بقوم فھو منھم[1] کیونکہ تشبہ عام ہے لباس اور طرز سب چیزوں کو اور گو ممکن ہے کہ اس پر کوئی شخص مولویوں کو متعصب کہے لیکن ہم کو اس کی اصلاً پروا نہیں کیونکہ ہم ایک موقع پر ان کے مسلم دلائل سے اس کا برا ہونا ثابت کرچکے ہیں۔ باقی حدیث تو اپنے ماننے والوں کے لئے پڑھی ہے اب میں ترقی کرکے کہتا ہوں کہ حدیث آپ پر بھی حجت ہے کیونکہ مسلمان تو آپ بھی ہیں۔

غرض اس وقت تقریرات میں تمام خرابیاں پیدا کی گئی ہیں جن سے بسبب قواعد شرعیہ کے چھوڑ دینے کے ان تقریروں کا وجود کالعدم سمجھا جائے گا۔ پس ثابت ہوگیا کہ جس طرح بیان کا وجود حسی موقوف ہے خلق انسان پر اسی طرح اس کا وجود شرعی موقوف ہے تعلیم قرآن پر اور یہی حاصل ہے ان آیات کا اور چونکہ تقاریر میں آج کل یہ نقص عام طور سے پیدا ہوگیا ہے۔ اس لئے یہ جی بھی چاہتا تھا کہ طریقہ بیان کے متعلق ایسی آیت اختیار کیجائے کہ قرآن شریف ہی سے اس کی خرابیوں کا ناجائز ہونا بھی ثابت ہوجاوے۔ سو بحمد اللہ یہ آیت الرحمٰن ۰ علم القرآن ۰ خلق الانسان ۰ علمہ البیان ۰ کہ اس میں تعلیم بیان کی شرط شرعی بھی مذکور رہے کہ قرآن شریف سکھلایا۔ کیونکہ غایت اس کی عمل ہے اور بیان اگر حدود شرعی کا لحاظ رہا تو قرآن پر عمل نہ ہوا کیونکہ عمل بالقرآن کے فوت ہونے کے معنیٰ یہی شریعت کا فوت ہونا ہے (تعلیم البیان ص۶)

---

[1] جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی تو وہ اسی میں کا ہوگیا۔

(۱۷) ہم لوگ تہذیب میں دوسری قوموں کے محتاج نہیں ہیں

بعضے لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ ہم تہذیب میں دوسری قوموں کے محتاج ہیں اور شریعت اسلام کو تہذیب سے معرّا سمجھتے ہیں۔ ان لوگوں کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے کہ ایک ایک چشم کی نسبت مشہور ہے کہ وہ دہلی میں گیا سیر کیلئے چاندنی چوک میں نکلا۔ اتفاق سے آپ کی گردن بھی نہ مڑسکتی تھی اسلئے جاتے وقت صرف ایک طرف کی دوکانیں نظر آئیں۔ دوسرے جانب کی نظر نہ آئیں۔ جب دہاں سے واپس ہونے لگا تو دوسری جانب کی دکانیں نظر آئیں۔ انکو دیکھ کر آپ فرماتے ہیں کہ دلی کے لوگ بھی کیا ستم کے لوگ ہیں۔ ابھی یہ دوکانیں داہنی جانب تھیں ابھی ہمارے لوٹنے سے پہلے ان کو بائیں جانب اٹھاکر رکھدیا۔

تو ہمارے بھائیوں نے بھی شریعت کو صرف ایک طرف سے دیکھا اسلئے وہ محتاج سمجھتے ہیں ورنہ شریعت اسلام میں وہ تہذیب ہے کہ دنیا میں کسی قوم کے اندر بھی اتنی تہذیب نہیں ہے چندروز اگر ہمارے پاس رہو اور پھر دیکھو کہ وہ شریعت جس کو آج خونخوار بتلایا جار۔ وہ کیسی دلفریب ہے۔ جب اس کی حقیقت سے واقف ہوگے تو اس پر عاشق ہوجاؤگے اور یہ کہوگے کہ ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

کہ سر سے پیر تک جہاں نظر کرو دل کھنچا چلا جاتا ہے۔ (مفاد المعیصت ص۱۱)

(۱۸) حضور صلی اللہ علیہ وسلم امریکہ تشریف نہیں لیگئے تو پھر حضورؐ کی بعثت عام کیسے ہوئی؟

ایک صاحب نے ایک مرتبہ یہ سوال کیا کہ یہ تو میرا اعتقاد ہے کہ جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی

بعثت عام ہے۔ لیکن یہ خلجان ہوتا ہے کہ امریکہ میں نہ تو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے اور نہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں بھیجا کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو ضرور کہیں ایسا منقول ہوتا حالانکہ منقول نہیں۔ نیز امریکہ کا حال بہت بعد میں معلوم ہوا ہے کہ ایک جہاز غلط رستے پر ہولیا تھا اور وہ وہاں پہونچ گیا۔ اور اس کو معلوم ہوا کہ یہاں بھی کچھ لوگ رہتے ہیں۔

جب وہاں آپ کی دعوت نہیں پہونچی تو نبوت عام کیسے ہوئی جواب میں فرمایا کہ بعثت عامہ کے معنیٰ سمجھنے میں غلطی ہوئی۔ بعثت کے عام ہونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ جب کبھی جس کسی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خبر پہونچی اور وہ آپ پر ایمان نہ لائے اور احکام قبول نہ کرے تو وہ کافر ہے اور یہ معنیٰ نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں حضورؐ کی بعثت کی خبر ساری دنیا کو ہوگئی تھی۔

اس تقریر کے بعد اب کوئی شبہ نہیں ہے۔ پس امریکہ میں جس وقت خبر پہونچی اسی وقت سے وہاں کے لوگ مکلف ہوں گے (مجادلت معدلت و دعوات عبدیت حصہ پنجم ملفوظ ۲۴)

(۱۹) جب انسان کی تقدیر میں یہ لکھ دیا گیا کہ وہ فلاں گناہ کرے گا تو پھر انسان مجرم کیوں؟

فرمایا کہ یہ مجبوری عمل کے بعد معلوم ہوتی ہے یعنی جب گناہ کر چکا اس وقت خبر ہوئی کہ یہ گناہ میری قسمت میں لکھا ہوا تھا۔ اس کے قبل جب گناہ کیا ہے تو اس کی خبر نہ تھی۔ اور اگر کہا جائے کہ گو اس کو علم تقدیر کا نہ تھا مگر واقع میں تو علم الٰہی اس کے متعلق تھا اور اس کا خلاف محال ہے تو اس طرح واقع میں مجبور ہوا۔

اب جواب یہ ہے کہ علم الٰہی اس طرح تھا کہ یہ شخص اپنے اختیار سے ایسا کرے گا تو اختیار منفی ہوا۔ یا اور مؤکد ہوگیا۔ پھر سوال کیا گیا کہ اگرچہ انسان کا مجبور ہونا لازم نہیں آتا لیکن خدائے تعالیٰ رحیم ہیں اسلئے اگر اپنی رحمت سے ہوائے نفسانی کو پیدا ہی نہ کرتے۔ تو انسان کے لئے بہتر ہوتا۔ اس پر فرمایا کہ خدا تعالیٰ کی متعدد صفات ہیں، ازاں جملہ ایک صفت حکیم ہونا

بھی ہے اور ہر صفت کا ایک خاص ظہور ہے پس جس طرح ہوائے نفسانی وغیرہ کا پیدا نہ ہونا مقتضائے رحمت ہے اسی طرح ان کا پیدا ہونا مقتضائے حکمت ہے۔

رہا سوال کہ وہ کیا حکمت ہے؟ اس کا اصل جواب یہ ہے کہ ہم کو اس حکمت کی اطلاع نہیں ہے۔ اور فرمایا کہ یہ جواب کم فہموں کے نزدیک زبردستی کا جواب معلوم ہوتا ہے لیکن اصل جواب یہی ہے۔ البتہ اس جواب کی حقیقت سمجھنے کے لئے اس کے قبل چند مقدمات سمجھنے کی ضرورت ہے جب تک کہ وہ سمجھ میں نہ آئیں اس وقت تک اس کی حقیقت سمجھنی مشکل ہے اور اس وقت تک یہ زبردستی کا جواب نظر آتا ہے۔

پھر فرمایا کہ جب انسان کے ہر عمل میں اختیار کا سلسلہ امور غیر اختیاریہ تک پہونچتا ہے جس سے اہل سائنس بھی انکار نہیں کرتے اور بنار تقدیر یہی امر ہے جیسا اوپر بیان ہوا تو اہل طبیعات کو تو تقدیر کا ضرور ہی قائل ہونا چاہئے کیونکہ وہ لوگ اس مسئلہ انتہاء الاختیار الی غیر الاختیار کو اس حد تک مانتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے افعال اختیاری کو بھی اس قاعدہ کا پابند کرتے ہیں۔ چنانچہ تخلیقِ اختیاری کو موقوف مانتے ہیں۔ وجود مادہ قدیمہ پر، جس کو اختیار خداوندی سے خارج کہتے ہیں۔ گو اہل حق اس کے قائل نہیں پس اس تسلیم کردہ مسئلہ کی بنا پر ان طبیعیین کو تو ہم سے زیادہ قائل تقدیر ہونا چاہیئے۔

(مجادلت معدلت، دعوات عبدیت حصہ دوم ملفوظ ۲۲)

(۲۰) اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے سلطنت چھین کر کفار کو کس لئے دیدی

فرمایا کہ جو چیز نہایت صاف شفاف ہو اس پر دھبہ ہونا نہایت ناگوار ہوتا ہے اور جو چیز خود میلی ہو اس پر ناگوار نہیں ہوتا جیسے ٹوپی چھینٹ لگ جانے سے اتار کر پھینک دیتے ہیں اور جوتے میں لگ جانے سے کوئی ناگواری نہیں ہوتی۔ ایسے ہی مسلمان دعویٰ محبت کرتے ہیں۔ ان سے ذراسی بے احتیاطی ناگوار ہوتی ہے بخلاف اعداء[1] کے کہ وہ جتنے بھی

[1] دشمن

اصول پر عمل کرلیں تو اللہ میاں ان کو دیدیتے ہیں اگرچہ وہ اللہ تعالیٰ کے دشمن ہی ہیں۔

(مجادلات معدلت حصہ سوم دعوات عبدیت ملفوظ ۲۱)

(۲۱) اس اعتراض کا جواب کہ سود کے بند کردینے سے ہماری قوم پر تباہی آگئی

عقلاء وقت اس میں مختلف ہیں کہ تباہی قوم کا کیا سبب ہے میرے نزدیک تو اصل سبب تباہی کا بدمعاملگی ہے۔ بعض قوم کے ریفارمر کہتے ہیں کہ سود کے بند کرنے سے تباہی آئی۔ جو قومیں سود لیتی ہیں وہ خوب ترقی کرتی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ مسلمانوں میں بھی بہت سے سود لیتے ہیں۔ لیکن ان کے کچھ بھی کام نہیں آتا۔ کیوں کہ مال سے مقصود تمتع دنیوی ہے۔ اور سود خوار جمع کرتے کرتے مرجاتے ہیں اور بسا اوقات جن کے لئے جمع کرتے ہیں انکو بھی نہیں ملتا ہے اور فرض کرو اگر متمتع بھی ہوئے تو روحانی ضرر سے تو خالی رہتے ہی نہیں یعنی سخت دل ہوجاتے ہیں۔ کسی پر انکو رحم نہیں آتا کسی کی مصیبت سے ان کا دل نہیں دکھتا اور اپنے رشتہ دار سے بھی سود نہیں چھوڑتے۔ جیسے بیرسٹروں کا حال ہے کہ وہ اپنوں کو بھی نہیں چھوڑتے سمجھتے ہیں کہ اگر ان سے نہ لیا تو نرخ بگڑ جائے گا۔ اور اکثر سود خواروں کو ترقی دنیوی بھی نہیں ہوتی۔ اکثر سود خواروں کا مال ضائع ہوتے ہی دیکھا ہے۔ اور فرض کرو اگر ترقی بھی ہوئی تو جب دین برباد ہوا تو اس ترقی کو لیکر کیا کریں گے ؎

مباد اول آں فرومایہ شاد   که از بهر دنیا دهد دیں بباد

ترقی خوش معاملگی میں ہے

یہ تو دینی غلطی تھی کہ سود کو ترقی کا سبب قرار دیا۔ دوسرے ایک دنیاوی غلطی بھی ہے وہ یہ ہے کہ ترقی کا سبب وہ شئ ہوسکتی ہے جس سے عام لوگ منتفع ہوں۔ اسلئے کہ ترقی یافتہ وہی قوم ہوگی جس کے سب افراد کو ترقی ہو اور عام طور سے ان میں غنیٰ پیدا ہوں اور سود ایسی شے ہے کہ ساری قوم میں شائع نہیں ہوسکتا۔ اول تو سب کے پاس مال نہیں۔ دوسرے آخر لے گا کون۔ اسلئے لامحالہ بعض لیں گے اور بعض نہیں۔ تو جو لیں گے وہ تو ترقی کریں گے اور جو نہیں

لیں گے وہ ترقی نہیں کریں گے بلکہ جو دیں گے وہ تباہ ہوں گے پس یہ طریقہ ترقی کا نہیں ہوسکتا ترقی کا صریح طریقہ خوش معاملگی اور اعتبار ہے۔ مسلمانوں میں خدا کے فضل سے افلاس نہیں۔ مسلمانوں میں تاجر، اہل ملک، رئیس سب طرح کی مخلوق ہے مگر بات کیا ہے کہ دوسری قوموں کو سود دیتے ہیں۔ اس وجہ سے تباہی آتی ہے۔ تو ایسی صورت ہونی چاہیئے کہ سود نہ دینا پڑے اور وہ طریقہ صرف خوش معاملگی ہے۔

بدمعاملگی کا انجام

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ مسلمانوں کو روپے کی ضرورت ہوتی ہے اور اپنے بھائیوں سے بلا سودی ملتا نہیں اس لئے غیر قوم سے سودی قرض لینے کی ضرورت ہوتی ہے اور تباہ ہوتے ہیں۔ اور بے سود قرض نہ ملنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ دوسرے مسلمانوں کے پاس روپیہ نہیں ہے۔ ابھی میں عرض کرچکا ہوں کہ مسلمانوں میں بہت مالدار ہیں۔ لیکن وہ بوجہ خوف بدمعاملگی کے قرض نہیں دیتے۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ خود چاہتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کی امداد کریں اور انکو قرض دیں مگر ڈرتے ہیں کہ دیکر کیا لے لیں گے اگر خوش معاملگی مسلمانوں میں شائع ہوجائے تو خود آپس ہی میں ایک دوسرے کی حاجت پوری ہوتی رہے اور سود دینے کی ضرورت نہ پڑے تو جو تباہی کا سبب ہے رفع ہوجائے۔

پس ثابت ہوا کہ بدمعاملگی تنزل کا سبب ہے۔ ہم لوگوں کی یہ حالت ہے کہ کسی کا روپیہ لیکر دینا نہیں چاہتے۔ حتیٰ کہ اگر کسی غریب کے چار پیسے ہوں گے تو وہ بھی ٹال کردیں گے اور اس کو لازمۂ ریاست سمجھتے ہیں کہ ہم سے تقاضہ کرنے کی مجال نہ ہوئی۔ اسی طرح قرض خواہ کو نہ دیں گے اور بہانہ کردیں گے کہ بھائی ابھی خرچ نہیں آیا۔ اور اسی حالت میں اگر بچہ کی ختنہ درپیش ہوجائے یا کوئی شادی کرنا ہو تو بہتیرا روپیہ اگل دیں گے غرض بدمعاملگی کا مرض عام ہے۔

(تعظیم الشعائر ص ۱۱)

(۲۲) کیا تمام علوم قرآن شریف میں ہیں

بعض لوگ کہتے ہیں کہ تمام علوم حتیٰ کہ طبعیات، سائنس وغیرہ سب قرآن شریف میں ہیں۔ چنانچہ ایک شخص نے مجھ سے کہا کہ ڈاکٹروں نے تحقیق کرلیا کہ مادہ منویہ میں کیڑے ہوتے ہیں۔ سو قرآن مجید میں بھی یہ مسئلہ مذکور ہے اس لئے کہ فرمایا ہے خَلَقَ الْاِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ،

اور علق کے معنی جونک کے ہیں۔ حالانکہ یہاں علق کے یہ معنیٰ نہیں ہیں بلکہ خون لبستہ کے ہیں وزبردستی ان تحقیق کو قرآن شریف کا مدلول بناتے ہیں۔

ایک اور سائنسداں کہتے تھے کہ جیسے حیوانات میں نر و مادہ ہیں اسی طرح نباتات میں بھی ہیں اور قرآن شریف میں اس کا بھی ذکر ہے خلق الازواج کلھا اس عقلمند نے ازواج کا ترجمہ میاں بیوی سے کیا حالانکہ زوج کے یہاں یہ معنیٰ نہیں ہے بلکہ بمعنی اصناف ہے۔

صاحبو! یہ طریقہ جو اختیار کیا گیا ہے یہ سخت مضر ہے۔ ع

دوستی بے خرد چوں دشمنی ست

ہر تحقیق کی جستجو قرآن میں درست نہیں

اس میں بڑی دشمنی ہے اسلام کے ساتھ اسلئے یہ ثابت ہوچکا ہے کہ سائنس کے مسائل منقح نہیں ہوئے اور اس کو اہل سائنس بھی مانتے ہیں کہ ہم کو اب تک اس دریا کا قطرہ بھی حاصل نہیں ہوا پس جب کہ مسائل منقح نہیں ہوئے تو اگر آج آپ نے کسی جدید تحقیق کو قرآن شریف کا مدلول بنایا مثلاً یہی کہ تخم درخت میں تر و مادہ ہوتے ہیں اور سو برس بعد یہ تحقیق غلط ثابت ہوگئی اور دوسری تحقیق نئی ہوئی تو اس میں تکذیب کلام الٰہی کی بھی لازم آئے گی پس یہ لوگ یصدون عن سبیل اللہ کے مصداق بن رہیں ہیں غرض یہ کوشش کرنا کہ سب چیز قرآن شریف سے ثابت ہو سخت حماقت ہے۔ بلکہ قرآن شریف کا کمال یہ ہے کہ جس فن کی وہ کتاب ہے وہ فن اس میں ہو اور دیگر خرافات سے خالی ہو۔ قرآن شریف ایک طب روحانی ہے اور اس فن میں وہ یکتا ہے اور موٹی بات ہے۔ کہ جب مسائل دینیہ فرعیہ بھی سب کے سب قرآن شریف میں نہیں ہیں۔ تو فنون و تجربے کے مسائل تو اس میں کل کیسے ہوں گے۔ (اطاعت الاحکام ص۶۱)

(۲۳) اس شبہ کا جواب کہ زکوٰۃ دینے سے مال کم ہوتا ہے۔ بڑھتا کہاں ہے

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم تو گن کر روپئے رکھتے ہیں اور زکوٰۃ دینے کے بعد پھر گنتے ہیں تو کم ہوجاتے ہیں۔ بڑھنا تو درکنار برابر بھی نہیں رہتے۔ بات یہ ہے کہ بڑھنے کی حقیقت

اور غرض پر اگر نظر ہوتی تو یہ شبہہ نہ ہوتا مال کے بڑھنے سے غرض یہ ہے کہ وہ بڑھتا ہوا مال اپنے کام آئے۔ چنانچہ اگر کسی کے پاس کروڑوں روپیہ ہو۔ اور اس کے کام نہ آئے بلکہ فضولیات میں ضائع ہوجائے۔ اور ایک شخص کے پاس دس روپئے ہوں لیکن دس کے دس اس کے کام آئے یہ شخص اس سے بدرجہا بڑھ کر ہے۔ سو ہم کھلی آنکھوں مشاہدہ کرتے ہیں کہ دو شخص ہیں اور ان کی برابر آمدنی ہے مگر فرق اتنا ہے کہ ایک زکوٰۃ دیتا ہے اور تمام حقوق واجبہ ادا کرتا ہے۔ سو اس کی چین و آرام سے زندگی گذرتی ہے۔ اور دوسرا شخص جو حقوق ادا نہیں کرتا وہ ہمیشہ پریشانی میں رہتا ہے۔ آج چوری ہوگئی کل کوئی مقدمہ قائم ہوگیا۔ خود بیمار ہوگئے، بچے بیمار ہوگئے۔ عطار کے یہاں روپیہ جارہا ہے۔ طبیب کی فیس میں روپیہ خرچ ہورہا ہے۔ بخلاف پہلے شخص کے کہ جس قدر آمدنی ہے وہ سب اس کے کام آرہی ہے جو مال بڑھنے سے غرض ہے وہ اس کا حاصل ہے۔

غرض اللہ تعالیٰ جس قدر لیتے ہیں اس سے زیادہ دیتے ہیں اور پھر جو لیتے ہیں وہ بھی ہمارے ہی لئے ہیں۔ (ذکر الموت ص۹۸)

(۲۴) اس شبہ کا جواب کہ دیندار لوگ مصائب میں زیادہ مبتلا رہتے ہیں

آپ کہیں کہ ہم تو کھلی آنکھوں دیکھتے ہیں کہ فرمانبرداروں کے زیادہ کام اٹکتے ہیں کوئی تنگدست ہے کوئی بیمار ہے، غرض فرمانبرداروں پر زیادہ مصائب آتے ہیں۔

جواب یہ ہے کہ کامیابی کی ایک تو صورت ہوتی ہے اور ایک اس کی حقیقت و روح ہوتی ہے مال اور صحت اور جاہ یہ کامیابی کی صورت ہے اور حقیقت اور روح اس کی راحت و جمعیت قلب ہے مال و جاہ اور صحت سب سے مقصود اطمینان اور راحت ہے۔ اگر سب کچھ ہو لیکن قلب پریشان ہو تو اس کو اہل دنیا بھی کامیابی شمار نہیں کرتے۔ چنانچہ اگر ایک شخص کے یہاں مال و دولت حشمت و شوکت سب کچھ ہو اور اس کو پھانسی کا حکم ہوجاوے اور اس کے مقابلہ میں ایک شخص فرض کیا جاوے کہ جس کے پاس ایک پیسہ نہیں ہے اور

مزدوری کرکے اطمینان کے ساتھ اپنا پیٹ پالتا ہے۔ اس سے اگر یہ کہا جاوے کہ فلاں شخص کی تمام دولت تم کو ملے گی اگر بجائے اس کے تم پھانسی پر چڑھ جاؤ اور یہ اقرار کرلو کہ قاتل میں ہوں، وہ ہرگز منظور نہ کرے گا۔ اور کہے گا کہ میں دولت کو لے کر کیا چولھے میں ڈالوں گا جب میری جان ہی نہ ہوگی تو ایسی دولت کو کیا کروں گا اور اس دولت مند سے اگر پوچھا جائے کہ تم کو خلاص ہوجائے مگر اس شرط سے کہ اس کا فقر وفاقہ تم کو ملے گا تو وہ خوشی سے راضی ہوجائے گا۔

معلوم ہوا کہ کامیابی کی حقیقت مال وجاہ وصحت نہیں ہے بلکہ حقیقت اس کی اطمینان اور راحت قلب ہے۔

اہل اللہ کا حال

پس ہم دعویٰ سے کہتے ہیں کہ اگر اہل اللہ پر فقر وفاقہ خواہ کسی قدر ہوں ان کا قلب پریشان نہیں ہوتا اور نافرمان کو کتنی ہی عیش وعشرت ہو لیکن اس کا قلب ہمیشہ پریشان ہے۔ خاص کر مسلمان کو تو نافرمانی میں آرام ملتا ہی نہیں کیونکہ اس کو وہاں زیاں[1] کا بھی کھٹکا لگا ہے۔ تو اس کا گناہ اور بھی بے لذت ہے۔

اب آپ کی سمجھ میں آگیا ہوگا کہ فرمانبرداری سے روح کو عیش میسر ہوتی ہے ظاہری ناداری اور تنگ دستی اس کو پریشان نہیں کرتی ہے۔ کیمیا اگرچہ مفلس ہو لیکن وہ ہر وقت خوش ہے کہ جب چاہوں گا سونا بنالوں گا۔ اس واسطے بڑے بڑے والیانِ ملک اور حکام وقت اس کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں۔

پس صاحبو! جب کہ وہ کیمیا جو تانبے کو سونا بنادیتی ہے یہ اثر رکھتی ہے تو حقیقی کیمیا یعنی حق تعالیٰ کی محبت اور اطاعت میں کیا یہ اثر نہ ہوگا۔

پس یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ شریعت پر عمل کرنے سے کامیابی نہیں ہوتی اور یہ ثابت ہوگیا کہ حقیقی کامیابی اتباع شریعت میں ہی منحصر ہے۔ (شرط الایمان ص۲۲۴)

(۲۵) ناول بینی کی مضرتیں

اس میں اس قدر مشغولی ہوتی ہے کہ سوائے اس کے قلب میں کچھ نہیں ہوتا اگر کوئی کہے

[1] نقصان

کہ غفلت تو کچہری میں کام کرنے اور روٹی کھانے پکانے سب میں ہوتی ہے تو چاہئے کہ سب چھوڑ دیں۔

بات یہ ہے کہ کام دو قسم کے ہیں، ایک ضروری اور ایک غیر ضروری۔ ضروری اشغال کا یوں تجربہ ہوا ہے کہ مضر نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس کو ضروری سمجھ کر آدمی اس میں پھنستا ہے اور اور جب اس کو ضروری سمجھا تو اصلی کام دوسری شئے کو سمجھے گا تو دل اسی اصلی کام کی طرف رہے گا کہ اس کام سے فارغ ہوکر اپنا اصلی کام کریں گے۔ اور جو تھوڑی غفلت اس میں ہوجاتی ہے اس کیلئے استغفار کا حکم فرمایا ہے کہ استغفار سے وہ دھل دھلا جاوے گی۔ اور غیر ضروری کی نسبت یہ تو خیال ہے نہیں کہ یہ ضروری ہے اس لئے اس کو ہی مقصود سمجھے گا اور وہ مضر ہے اور مورثِ غفلت ہے، اور یہ غفلت بڑھتے بڑھتے مفضی الی الکبائر بلکہ الی الکفر ہوجاتی ہے۔

ناول دیکھنا نقصان دہ ہے

بالخصوص ناول سے ایک بڑا ہی سخت مرض پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ اس کے دیکھنے سے بدمعاشی کے طریقے خوب یاد ہوجاتے ہیں۔ ہمارے ناول کے شیدائی پرانے قصوں پر اعتراض کرتے ہیں اور تاریکی اور خلاف تہذیب سمجھتے ہیں لیکن اس تاریکی اور اس روشنی میں اس قدر فرق ہے کہ اس تاریکی میں وقت تو ضائع ہوجاتا ہے لیکن اخلاق پر برا اثر نہیں پڑتا۔ اس لئے کہ وہ قصے صریحاً کذب اور عادۃً مستحیل ہیں مثلاً گل بکاؤلی کا قصہ۔ بکاؤلی کی تصویر اور جنوں کی عمل داری وغیرہ من الخرافات، ان قصوں سے کوئی ترکیب بدمعاشی کی نہیں سیکھ سکتا۔ کیونکہ اس میں وصال بکاؤلی کا طریقہ ایک جن کا مہربان ہوکر پہونچا دینا ہے تو اس کو کوئی کس طرح حاصل کریگا۔

بخلاف ناولوں کے کہ اس میں لکھا ہے کہ ماما کے ہاتھ رقعہ بھیج دیا جس کو ہر شخص کرسکتا ہے۔

ناول کا طرز چونکہ ایسا دکھلایا جاتا ہے جیسے واقعات ہوتے ہیں اس لئے اس کا ایک اثر خبیث پڑتا ہے کہ اکثر آدمی اس کے دیکھنے سے عشق نساء یا اطفال میں مبتلا ہوجاتا ہے اور قلب میں سوزش کی سی کیفیت ہوجاتی ہے اور یہ سخت مضر ہوتا ہے۔ (الصوم ص۹۴)

(۲۶) اس شبہ کا جواب کہ قرآن مجید میں تکرار مضامین کیوں ہے

اللہ تعالیٰ نے تمام احکام کو صاف صاف بیان فرمادیا۔ اور ایک مرتبہ نہیں بلکہ مکرر سہ کرر بیان فرمایا کہ کوئی اشتباہ ہی نہیں رہا ہم نے کیا کیا اس کی قدر تو کی نہیں برعکس اسکے اس میں شبہات نکالنے لگے، کہ حق تعالیٰ نے اس مضمون کو مکرر کیوں بیان فرمایا۔

تکرار مضامین کی وجہ

اللہ تعالیٰ نے اس تکرار کی حکمت بھی ارشاد فرمائی ہے چنانچہ فرماتے ہیں ولقد صرفنا القرآن للناس لیذکروا یعنی ہم نے لوگوں کے لئے طرح طرح سے اس لئے بیان کیا ہے تاکہ نصیحت قبول کریں۔

اس کی قدر اس کو ہوگی جو باپ کی شفقت کو پیش نظر رکھے دیکھو باپ بیٹے کو کس کس طرح سے سمجھاتا ہے صرف ایک مرتبہ کے سمجھانے پر اکتفا نہیں کرتا اور نہ ایک مرتبہ سمجھانے کے بعد مواخذہ کرتا ہے بلکہ ایک مرتبہ سمجھاتا ہے دوسری تیسری چوتھی مرتبہ بار بار سمجھاتا ہے جب تک کہ بیٹے کی اصلاح نہ ہو اسکو چین نہیں آتا۔ جب بالکل لاچار ہوجاتا ہے بمجبوری زجر و توبیخ سے کام لیتا ہے پھر اس میں بھی ایلام اور ایذا مقصود نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی درستی اور تہذیب مدنظر ہوتی ہے حق تعالیٰ کو تو باپ سے بدرجہا زیادہ شفقت ہے اور اس کو باپ سے زیادہ اسکے مصالح کی رعایت ہے۔ اسی وجہ سے ایک ہی مضمون کو مختلف عنوانوں نوع بنوع کے طرز سے بیان فرمایا ہے۔ اور پھر باپ کے احسان اور حق تعالیٰ کے احسانات میں فرق عظیم یہ ہے کہ باپ کو بیٹے کے حال پر جو عنایت ہے اس کا منشا تو غرض ہے، کہ باپ کو یہ امید ہوتی ہے کہ بیٹا میرے کام آوے گا۔ یا یہ کہ اس سے میرا نام چلے گا۔ اور کچھ نہیں یہ ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اولاد کے ساتھ ایسا علاقہ پیدا کر دیا ہے کہ اس سے وہ اس کی تربیت وصلاح کی طرف مضطرب ہوتا ہے اور اسی سے اس کو راحت ہوتی ہے۔

انسان محتاج محض ہے

بہرحال کوئی نہ کوئی غرض ضرور ہوتی ہے اور حق تعالیٰ کو انسان کی کوئی احتیاج نہیں ہے غنی بالذات ہے اور نہ ہماری طرح کسی شئی سے وہ متأثر ہوتے ہیں، ہم تو محبت سے یا کسی دوسری غرض سے مجبور بھی ہوجاتے ہیں

اور وہاں چونکہ غنی ذاتی ہے اسلئے کسی شئی کی احتیاج نہیں اور ماسوا اس کے سب محتاج ہیں بلکہ انسان احتیاج میں تمام مخلوقات سے اول نمبر ہے۔ اسلئے کہ اگر عالم میں انسان نہ رہے تو کسی شئی میں کوئی خلل نہ آوے سب اپنے حال پر رہیں اور اگر عالم میں سے ایک شئی بھی نہ رہے تو انسان کی بقا دشواری ہوجائے۔ مثلاً پانی نہ رہے یا آگ نہ رہے تو انسان زندہ نہیں رہ سکتا اور اگر انسان ایک بھی نہ رہے تو ان چیزوں میں سے کسی کا کچھ بھی نقصان نہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ انسان ہر شئی کا محتاج ہے۔

محتاجی کی وجہ

اور یہ بات کہ باوجود اشرف المخلوقات ہونے کے یہ اتنا محتاج کیوں ہوا۔ سو راز اس میں یہ ہے کہ اس کو اپنی اشرفیت پر نظر کر کے عجب نہ ہوجائے اس لئے اتنی حاجتیں اس کے پیچھے لگادی گئی ہیں کہ جب ناز اور فخر ہو تو فوراً اس طرف بھی نظر کرے کہ میں کیا ناز کروں میں تو ایک ایک جزء عالم کا محتاج ہوں۔ اس کے سوا اور بھی حکمتیں ہونگی۔

اللہ تعالیٰ محتاج نہیں

بہرحال انسان سب چیزوں کا محتاج ہے اور کوئی شئی انسان کی محتاج نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کو انسان کی کیا احتیاج ہوئی۔ جن چیزوں کا انسان خود محتاج ہے اللہ تعالیٰ کو ان کی بھی احتیاج نہیں بلکہ یہ امر عقلاً ونقلاً ثابت ہے کہ ہر شئی اپنے وجود اور بقا میں حق تعالیٰ کی محتاج ہے۔ پس حق تعالیٰ کے اس استغنا اور انسان کے احوج ترین مخلوقات ہونے کا اقتضاء تو یہ تھا کہ انسان کی بات بھی نہ پوچھتے اور احکام کا مخاطب نہ بناتے۔ لیکن اس سے یہ لازم نہ آتا کہ حقوق بھی نہ ہوتے، حقوق تو ضرور ہی ہوتے ہیں۔ پس جب حقوق ہوتے اور ان کے ادا کا طریقہ بتلایا نہ جاتا تو سخت مصیبت ہوتی جو آقا اشاروں اور رموز پر خادموں کو چلاتے ہیں خادموں کو سخت مصیبت کا سامنا ہوتا ہے اور ایک دو ہی کوئی ایسا نکل آتا ہے جو اتنا مزاج شناس ہو کہ اشارہ کو سمجھے۔

شاہزادہ ایران کا واقعہ

علی حزیں شاہزادہ ایران کو اتفاق سے ایک خادم رمضانی نام ایسا مل گیا تھا کہ اشاروں کو سمجھتا تھا۔ ایک مرتبہ علی حزیں نے شاہ دہلی سے درخواست کی کہ ہم کو ایک سلیقہ دار خادم کی ضرورت ہے بادشاہ نے ایک بڑے ہوشیار شخص کو بھیجدیا۔

علی حزیں باغ میں بیٹھے تھے اور نیا خدمتگار باغ کے دروازے پر تھا۔ ایک شخص آیا اور اس نے ایک رقعہ دیا۔ اس خادم نے وہ رقعہ پہونچادیا اس میں درخواست تھی کہ لیموں عنایت

فرمائیے۔ علی حزیں نے چہرہ پر بل ڈال کر وہ رقعہ واپس دیدیا۔ یہ خادم سخت پریشان ہوا کہ زبان کو تو بند کر لیا اور چہرہ سے ناگواری کے آثار معلوم ہوتے ہیں۔ یہ کس بات پر بگڑے ہیں۔ اتفاق سے وہاں رمضانی بھی آنکلا اس سے خدمت گار نے سارا قصہ بیان کیا۔ رمضانی نے کہا چہرہ پر بل ڈال کر رقعہ دینے کا مطلب یہ ہے کہ لیموں دیدو، لیموں ترش ہوتا ہے انھوں نے چہرہ ترش کر کے بتلا دیا وہ خادم یہ سنکر بھاگا۔ اور سوچا کہ میں یہاں رہوں گا تو سخت مصیبت میں رہوں گا۔

اس حکایت کا خلاصہ

یہ حکایت صحیح ہے یا غلط ہے بہرحال میرا مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ بھی اشاروں سے کام لیتے تو حق تھا لیکن مصیبت ہوتی۔ اوران اشاروں کو سمجھنے والا کون تھا سو ایسا نہیں کیا بلکہ ایک مضمون کو خوب کھول کر دو دو مرتبہ تین تین مرتبہ بیان فرمایا اور بیان بھی اس طور سے نہیں فرمایا کہ کوئی پرچہ بھیجدیئے کہ اس کے پڑھنے اور سمجھنے یا عمل کرنے میں دقت ہوتی بلکہ ایک عجیب اور فطرت کے موافق طریقہ اختیار فرمایا۔ وہ یہ ہے کہ ایسی ذات مقدس کو بھیجا جن کی شان یہ ہے لقد جاءکم رسول من انفسکم یعنی تمہارے پاس ایک رسول آئے ہیں تمہاری جنس سے پس حضورؐ کا ہماری جنس سے ہونا ایک نعمت تو ہے اسلئے کہ اگر کسی فرشتہ یا جن کو نہ بھیج دیتے تو سب ہیبت ہی کے مارے مرجاتے اور آپس میں کچھ مناسبت نہ ہوتی۔

آج کل لوگ اس فکر میں ہیں کہ پیغمبر کو عبدیت اور بشریت کے مرتبے سے گذار کر اللہ تک پہونچادیں، گویا اس صفت کو مٹانا چاہتے ہیں کہ جو ہمارے اور ذاتِ حق میں واسطۂ اضافت ہوئی ہے حالانکہ عین رحمتِ الٰہی اور عین کمال نبویؐ بھی ہے کہ بشر ہو کر قرب کے ایسے درجہ پر تھے یہ تو کمال تھا اور رحمت اسلئے ہے کہ بشریت کی مناسبت سے بے راہوں کو راہ پر لادیں۔ (الشکر ص۱۰۵)

(۲۷) پردہ مروّجہ پر اعتراض کا جواب

جواب (۱) حق تعالیٰ نے بنون[1] کو زینت حیوٰۃ الدنیا بتلایا ہے بنات کو بیان نہیں فرمایا۔ اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ بنات کو خود تم نے بھی بے حقیقت سمجھ رکھا ہے کیونکہ لوگوں کو لڑکوں سے

[1] لڑکوں

زیادہ خوشی ہوتی ہے اور لڑکیوں کو تو عموماً وبال سمجھتے ہیں۔ تو تمہارے نزدیک وہ کیا خاک زینت دنیا ہونگی۔ دوسرا نکتہ بنات کے ذکر نہ کرنے میں یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے یہ بتلادیا کہ بنات[1] زینت دنیا بھی نہیں ہیں بلکہ محض زینت خانہ ہیں۔ اگر وہ بھی زینت دنیا ہوتیں تو حق تعالیٰ ان کو بھی یہاں ذکر فرماتے پس صرف بنون کو زینت دنیا فرمایا اور بنات کو ذکر نہ فرمایا اس کی دلیل یہ ہے کہ لڑکیاں دنیا کی زینت نہیں ہیں کیونکہ عرفاً زینت دنیا وہ سمجھی جاتی ہیں جو منظر عام پر زینت بخش ہو اور وہ ایسی زینت نہیں ہیں کہ تم ان کو ساتھ لیئے پھرو اور سب دیکھیں کہ انکی اتنی لڑکیاں ہیں اور ایسی آراستہ و پیراستہ ہیں بلکہ وہ محض گھر کی زینت ہیں یہاں سے پردہ کی دلیل کی طرف اشارہ نکل آیا۔

عورت کا پردہ

دوسرے لغت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ عورتوں کا پردہ کرایا جائے کیونکہ اردو میں عورت کو عورت کہتے جس کے معنی لغت میں چھپانے کی چیز کے ہیں تو اس کے ساتھ یہ کہنا کہ عورت کو پردہ نہ کراؤ ایسا ہے جیسا یوں کہا جائے کہ کھانے کی چیز کو نہ کھاؤ پہننے کی چیز کو نہ پہنو اور اس کا لغو ہونا ظاہر ہے کہ عورتوں کا پردہ نہ کراؤ انکو عورت کہنا خود اس کی دلیل ہے کہ وہ پردہ میں رہنے کی چیزیں ہیں۔

ایک ترقی یافتہ کہتے تھے کہ عورتیں پردہ کی وجہ سے ترقی علم سے رکی ہوئی ہیں۔ میں نے کہا جی ہاں اسی واسطے تو ان چھوٹی قوموں کی عورتیں جو پردہ نہیں کرتیں بہت تعلیم یافتہ ہوگئی ہیں۔ یہ جواب سن کر وہ خاموش ہی تو رہ گئے۔

پردہ تعلیم کیلئے مضر نہیں

اصل بات یہ ہے کہ تعلیم یافتہ ہونے میں پردہ یا بے پردگی کو کوئی دخل نہیں بلکہ اس میں بڑا دخل توجہ کو ہے۔ اگر کسی قوم کی عورتوں کی تعلیم پر توجہ ہو تو وہ پردہ میں بھی تعلیم دے سکتے ہیں ورنہ بے پردگی میں بھی کچھ نہیں ہوسکتا، بلکہ غور کیا جائے تو پردہ میں تعلیم زیادہ ہوسکتی ہے، کیونکہ تعلیم کے لیے یکسوئی اور اجتماع خیال کی ضرورت ہے اور وہ گوشۂ تنہائی میں زیادہ حاصل ہوتی ہے۔ اس واسطے مرد بھی مطالعہ کے لئے گوشۂ تنہائی تلاش کیا کرتے ہیں۔ جیسا کہ طلبا کو اسکا اچھی طرح اندازہ ہے۔

[1] بنون کے معنی لڑکے اور بنات کے معنی لڑکیاں

پردہ کی وجہ

پس عورتوں کا پردہ میں رہنا تو علوم کے لئے معین ہے نہ کہ مانع نہ معلوم لوگوں کی عقلیں کیا ہوئیں جو پردہ کو تعلیم کا منافی سمجھتے ہیں ہاں علوم تجارت کے لئے سیر و سیاحت کی البتہ ضرورت ہے مگر عورتیں ناقص العقل اور کم حوصلہ ہیں ان کے لئے سیر و سیاحت سے تجربے میں حقیقی یعنی اخلاقی ترقی نہ ہوگی۔ بلکہ آزادی اور شرارت بڑھے گی اس لئے شریعت نے عورتوں کے ہاتھ میں طلاق نہیں دی۔ کیونکہ یہ ایسی کم حوصلہ ہیں کہ ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہو جاتی ہیں۔ مرد تو برسوں میں کسی بہت بڑی بات پر طلاق کا قصد کرتا ہے۔ وہ بھی ہزاروں میں سے ایک ورنہ زیادہ تو ایسے ہی مرد ہیں جو عورت کی بدتمیزیوں پر صبر کرتے ہیں۔ اور اگر عورتوں کے ہاتھ میں طلاق ہوتی تو یہ ہر مہینہ شوہر کو طلاق دے کر نئی شادیاں کیا کرتیں۔

پس عورتوں کے لئے یہی سیر و سیاحت کافی ہے کہ اپنے گھر میں چل پھر لیا کریں۔ جن تجربوں کی انکو ضرورت ہے وہ گھر میں رہ کر ہی انکو حاصل ہو سکتے ہیں بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ نظر حقیقت بیں سے دیکھئے تو مردوں کو بھی اس کی ضرورت نہیں۔ اگر سیر و تماشہ چاہتے ہو تو وہ بھی آپ کے اندر موجود ہے دل کی آنکھوں سے دیکھ لو۔ تم کو اپنے ہی اندر ایسا تماشہ نظر آئے گا کہ دنیا کے پھول پھلواڑیوں سے استغنار ہو جائے گا۔

ستم است گر ہوست کشد کہ بسیر سرو سمن درآ | تو زغنچہ کم ندمیدہ در دل کشا بچمن درآ
چوں کوئے دوست ہست بصحرا چہ حاجت ست | خلوت گزیدہ را بتماشا چہ حاجت ست

(مظاہر الآمال ص۱۶)

پردہ کی اہمیت

جواب (۲) مردوں کو تو یہ حکم فرمایا قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ یعنی آپ مومنین سے کہدیجئے کہ اپنی نگاہوں کو نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، اور عورتوں کے لئے یہ بھی حکم فرمایا اور اس پر اضافہ فرمایا وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ یعنی بناؤ سنگار کا موقع ظاہر نہ کریں۔ اور ظاہر ہے کہ بناؤ سنگار کا موقع وہ ہے کہ اکثر کھلا رہتا ہے جب اس کا اظہار بھی اجانب[1] کے سامنے جائز نہیں تو باقی تمام بدن کا تو کیسے جائز ہوگا۔

اور دوسرے مقام پر ارشاد ہے وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَاءِ الّٰتِيْ لَا يَرْجُوْنَ نِكَاحًا فَلَيْسَ

---

[1] غیروں

عَلَيْهِنَّ جُنَاحٌ اَنْ يَّضَعْنَ ثِيَابَهُنَّ غَيْرَ مُتَبَرِّجٰتٍ بِزِيْنَةٍ یعنی جو عورتیں بوڑھی ہوں وہ اگر اپنے زائد کپڑے اتار کر رکھدیں۔ جیسے اوپر تلے کپڑے ہوں اور اوپر کا کپڑا اتار دیں بشرطیکہ بدن ظاہر نہ ہو تو کچھ حرج نہیں، لیکن اس حالت میں بھی اپنے مواقع زینت کو ظاہر نہ کریں مثلاً گردن کان کہ ان میں زیور پہنا جاتا ہے۔ اور آگے ارشاد ہے وَاَنْ يَّسْتَعْفِفْنَ خَيْرٌ لَّهُنَّ یعنی یہ زائد کپڑے اتار کر رکھنے سے بچیں تو ان کیلئے زیادہ بہتر ہے۔

پس جب بوڑھیوں تک کیلئے یہ حکم ہے تو اے لڑکیو! اور اے جوان عورتو! تم کو کہاں اجازت ہوگی کہ دور دور کے رشتہ داروں کے سامنے بے محابا آجاؤ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ تو کوئی نہ ہوا نہ ہوگا خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سے عورتوں کو پردہ کراتے تھے۔

اور اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ آجکل جو بعضے تو تعلیم یافتہ کہتے ہیں کہ پردہ ضروری نہیں ہے اور ایسا پردہ قرآن و حدیث سے ثابت نہیں محض غلط ہے۔ بات یہ ہے کہ ان لوگوں نے قرآن و حدیث کو دیکھا ہی نہیں بس دیکھا کیا ہے کوئی اخبار دیکھ لیا گر کچھ عربی پڑھی ہے تو مصری اخبار دیکھ لیا۔

سو سمجھ لو کہ یہ پردہ جو آج کل مروج ہے یہ قرآن سے بھی ثابت ہے اور حدیث سے بھی ثابت ہے چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک عورت نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پردہ کے پیچھے سے خط دیا۔

خود سرور کائنات کا عمل

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سامنے عورتوں کو نہ آنے دیتے تھے اور قرآن اوپر گذرا ہے؟

پھر جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود سے پردہ کرا دیں، تو کون سا پیر ہے اور کون سا رشتہ دار ہے جس سے بے حجابی جائز ہوگی خواہ کوئی خالو ہو یا پھوپھا، دادا لگتا ہو یا چچا اگر وہ محرم نہ ہو اجنبی ہے بڑا ظلم و ستم ہے کہ عورتوں کو اس کی کچھ پرواہ نہیں ہے۔

ہم نے مانا کہ تمہارا دل پاک ہے لیکن تم کو دوسرے کی کیا خبر، اگر کہو کہ دوسرا بھی پاک ہے تو توبہ توبہ خدا اور رسول ﷺ کو تم نے ظالم قرار دیا کہ باوجودیکہ یہ پاک تھا پھر بھی اس سے پردہ کا حکم دیا۔ اگر یہ پاک صاف ہوتے تو حق تعالیٰ ضرور ان کا نام لکھدیتے کہ فلاں شخص پاک ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا قول

یاد رکھو اللہ تعالیٰ کو سب خبر ہے کہ کون پاک ہے اور کون نہیں ہے انبیاء سے زیادہ تو کوئی نہیں ہو سکتا۔ یوسف علیہ السلام باوجود نبی ہونے کے فرماتے ہیں وَمَا اُبَرِّئُ نَفْسِيْ اِنَّ النَّفْسَ

لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْءِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبِّیْ یعنی میں اپنے نفس کو بری نہیں کرتا ہوں، نفس تو بری بات کا حکم کرنے والا ہی ہے، مگر جس پر میرا رب رحمت فرمائے کہ وہ مستثنیٰ ہے۔

نفس کی پاکی کا دعویٰ

اب بتلائیے کہ کس کا منہ ہے جو کہے کہ میرا نفس پاک ہے۔ مجھ کو برا وسوسہ نہیں آتا اور اگر ایسا اتفاق ہوتا ہے تو وہ عارضی حالت ہے چنانچہ بعض بزرگوں کو اس میں دھوکا بھی ہوا ہے کہ انھوں نے جب دیکھا کہ انکو وسوسہ نہیں آتا تو یوں سمجھے کہ ہمارا نفس مزکیٰ ہو گیا ہے اسلئے انھوں نے غیر محرم کے اختلاط میں کوئی باک نہیں کیا اور پھر کسی فتنہ میں مبتلا ہو گئے خواہ وہ فتنہ قلب ہی کا ہو۔ اور یہ کارگذاری شیطان کی ہے کہ اس ترکیب سے کہاں سے کہاں تک لایا۔ اسی واسطے حق تعالیٰ نے اول یہ تدبیر بتلائی کہ نگاہ نیچی رکھو۔ اگر بضرورت تم کو کسی غیر کے سامنے آنا پڑے تو نگاہ نیچی اور کپڑوں میں لپٹ کر آؤ۔ یہ نگاہ بظاہر ہے بہت خفیف لیکن اصل تمام پھول پھل کی یہی ہے جیسے زکام ہے کہ بظاہر بہت ہلکی بیماری ہے لیکن سیکڑوں بیماریوں کا منشأ ہو جاتا ہے اسی طرح نظر بھی ہے کہ اگر یہ بگڑ گئی تو پھر آئندہ امن اٹھ گیا اسی واسطے اول اسی کو روکا ہے۔

ازواجِ مطہرات کا پردہ

دیکھو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیبیوں سے تو زیادہ کوئی عورت نہیں ہو سکتی ہیں میں تم کو قصہ سناتا ہوں جس سے تم کو اندازہ ہوگا کہ پردہ کس درجہ ضروری ہے۔

حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ ایک نابینا صحابی ہیں اور ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے ازواج مطہرات میں سے غالباً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیٹھی تھیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم پردہ میں ہو جاؤ۔ انھوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ وہ تو نابینا ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں افعمیتما وان انتما لستما تبصرانہ، یعنی کیا تم بھی اندھی ہو اسکو دیکھتی نہیں ہو۔

دیکھو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیبیاں امہات المومنین دوسری طرف نابینا صحابی، بھلا یہاں کون سے وسوسہ کا احتمال ہو سکتا ہے، مگر پھر بھی کس درجہ اہتمام کرایا۔ (العفة ص۷)

(۲۸) علماء ترقی سے مانع نہیں ہیں

جواب[۱]:۔ لوگ علماء کو ترقی سے مانع کہتے ہیں۔ آج میں اس الزام کو دفع کرنا

چاہتا ہوں اور اس وقت میں ترقی کی ضرورت ہی پر بیان کروں گا اس پر جنٹلمین چونکے کہ یہ ملا آدمی اور ترقی کا بیان۔ میں نے کہا کہ آپ تو ترقی کو صرف عقلی ضروری ہی کہتے اور میں اسے شرعی فرض کہتا ہوں۔ اس پر اور بھی حیرت ہوئی۔ میں نے کہا حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ یعنی ہر قوم کے لئے ایک جہت قبلہ مقرر ہے جس کی طرف وہ منہ کرتی ہے۔ پس ایک دوسرے پر سبقت کرو۔

اس آیت میں حق تعالیٰ نے ہم کو استباق کا حکم دیا جس کے معنی ایک دوسرے پر سبقت کرنے کے ہیں۔

تو اب جو لوگ علماء کو ترقی سے مانع کہتے ہیں وہ ان پر کتنا بڑا افترار کرتے ہیں۔ بھلا جس چیز کا قرآن میں امر ہے علماء کی مجال ہے کہ اس سے منع کر سکیں۔ پس ترقی کا ضروری ہونا تو متفق علیہ ہے البتہ اس کے طریقہ میں اختلاف ہے۔ جنٹلمین کہتے ہیں کہ جس طرح ہم کہیں اسی طرح ترقی کرو اور علماء کہتے ہیں کہ جس طرح قرآن کہے۔ اسی طرح ترقی کرو۔ سو قرآن میں فاستبقوا کے ساتھ الخیرات کی بھی قید ہے جس کا حاصل یہ ہوا کہ نیک کاموں میں ترقی کرو۔

اب اس اختلاف کا فیصلہ بہت جلد ہو سکتا ہے۔ آپ یہ ثابت کر دیں کہ جس ترقی کے آپ خواہاں ہیں وہ ترقی فی الخیر ہے تو میں اس کا ذمہ لیتا ہوں کہ علماء آپ کو اس ترقی سے منع نہ کرینگے اور اگر ترقی فی الشر ہے تو اس کا مطلوب نہ ہونا بلکہ مذموم ہونا تمام عقلاء کے نزدیک مسلم ہے ورنہ پھر ایک ڈاکو کو بھی یہ کہنے کا حق ہے کہ مجھے ڈاکہ سے کیوں منع کیا جاتا ہے۔ میں تو ترقی کا طالب ہوں، بتلائیے اسے کیا جواب دیں گے؟

ترقی محمود مطلوب ہے

ظاہر ہے کہ اس سے یہی کہا جائے گا کہ تیری یہ ترقی محمود نہیں بلکہ ترقی مذموم ہے جو کہ برے طریقے سے حاصل کیجاتی ہے۔ معلوم ہوا کہ ترقی مطلقاً مطلوب نہیں بلکہ وہی مطلوب ہے جو محمود ہو مذموم نہ ہو۔ بس اب یا تو آپ ثابت کر دیں کہ جس ترقی کے آپ طالب ہیں وہ محمود ہے، مذموم نہیں، یا ہم ثابت کر دیں کہ ترقی محمود وہی ہے جس کی ہم تعلیم دے رہے ہیں۔ اور یہ ترقی مذموم ہے جس کی تعلیم آپ دے رہے ہیں۔

اس تقریر سے بہت جلد سمجھ گئے اور اقرار کر لیا کہ واقعی علماء کو ترقی سے اختلاف نہیں بلکہ اس کے طریق تحصیل سے اختلاف ہے، کیونکہ ان طریق نے خلاف شرع ہونے کی

وجہ سے اس ترقی کو ترقی فی الشر کا مصداق بنادیا ہے۔

غرض دوسری قوموں کی ترقی دیکھ کر مسلمانوں کے منہ میں پانی بھر آتا ہے اور وہ انکی ہر حالت کو ترقی میں دخیل سمجھ کر اختیار کرتے جاتے ہیں۔ کبھی ان کی صورت و وضع کو اختیار کرتے ہیں کہ شاید اس کو ترقی میں دخل ہو، کبھی عورتوں کے پردہ کو اٹھانا چاہتے ہیں کہ یہی ترقی سے مانع ہے۔ اگر عورتیں آزاد رہیں گی تو علوم صنعت و حرفت سیکھ کر خود بھی ترقی کریں گی اور اولاد کو بھی ترقی یافتہ بنائیں گی۔

ایک صاحب نے میرے سامنے یہی دلیل بیان کی تھی۔ میں نے کہا کہ مسلمانوں میں صرف شرفاء کی عورتیں پردہ نشین ہیں جن کی تعداد ہندوستان میں بہت کم ہے زیادہ تعداد تو چھوٹی قوموں کی ہے اور ان میں پردہ کا ہمیشہ سے رواج نہیں ہے۔ اگر بے پردگی کو ترقی میں کچھ دخل ہے تو ان قوموں نے کیوں نہ کرلی۔ پس اس کا جواب کچھ نہ تھا، وہ میرے منہ کو تکنے لگے۔ (العبرۃ بذبح البقرۃ ص۴۵)

علماء پر غلط الزام

جواب (۲) ۔ یہ سب کہتے ہیں کہ عزت ور ترقی حاصل کرنا چاہیئے اور اس کے ساتھ ہی علماء پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ علماء ترقی کے مانع ہیں، میں کہتا ہوں کہ اس میں کچھ شک نہیں کہ عزت حاصل کرنا چاہیئے اور علماء اس کے مانع نہیں ہیں۔ اور علماء کیسے مانع ہوتے جس شئی کو قرآن و حدیث ثابت کرتے ہیں اس کو کون سا مولوی مٹانے والا ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ یعنی اللہ ہی کے لیئے عزت اور اس کے رسول ؐ کے لیئے اور مؤمنین کے لیئے، بھلا جس شخص کا اس آیت پر ایمان ہوگا وہ کیسے اس کی نفی کرے گا۔ پھر علماء پر الزام کیسا؟

بات یہ ہے کہ ان کی بات پوری طرح سنتے تو ہیں نہیں بے سوچے سمجھے ہانک دیا کہ علماء ترقی سے روکتے ہیں۔

صاحبو! علماء ترقی سے مانع نہیں ہیں علماء جو طالبان ترقی پر اعتراض کرتے ہیں۔ وہ نفس ترقی کی طلب پر نہیں بلکہ اس کا حاصل یہ ہے کہ آپ لوگ اس کو غیر طریق سے حاصل کر رہے ہیں طریق یہ نہیں ہے اگر کوئی پشاور جانا چاہے اور ٹکٹ لے لے کلکتہ کا اور اس کو کوئی اسکی غلطی پر آگاہ کرے تو وہ پشاور جانے کا اور ریل میں سوار ہونے کا مخالف نہیں بلکہ طریق کے اندر مخالفت کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ رستہ یہ نہیں ہے۔ پشاور کو دوسری گاڑی جاوے گی۔ اسکا

ٹکٹ لو وہ تم کو پشاور پہونچا دے گی۔

ریل کا ایک واقعہ

میرے ایک ہموطن اسٹیشن سہارنپور سے میرٹھ جانے والے لکھنؤ جانے والی گاڑی میں غلطی سے سوار ہوگئے۔ اتفاق سے میں بھی لکھنؤ جارہا تھا۔ عین روانگی کے وقت تو ان سے کوئی بات ہوئی نہیں اس لئے کہ خیال ہوا کہ یہ تو گاڑی میں موجود ہیں ہی۔ ان سے باطمینان بات کروں گا۔ جو لوگ مجھ کو پہونچانے کے لیئے آئے تھے ان سے باتیں کرتا رہا۔ جب ریل چھوٹ گئی تو انکی طرف متوجہ ہوا۔ میں نے پوچھا کہ آپ کہاں جائیں گے۔ کہنے لگے کہ میرٹھ، میں نے کہا کہ ممکن ہے کہ آپ میرٹھ جائیں مگر یہ گاڑی میرٹھ نہ جائے گی یہ تو رڑکی ہوتی ہوئی سیدھی لکھنؤ پہونچے گی۔ یہ سنکر تو بہت چکرائے اور سردی کا موسم تھا۔ ان جنٹلمینوں کو یہ بھی مرض ہے کہ کپڑا ساتھ نہیں لیتے اور رضائی اور روئی دار انگرکھا پہننے کو خلافِ تہذیب سمجھتے ہیں۔ بیک بینی و دو گوش ہی سفر کرتے ہیں ایسے ہی وہ بھی تھے، خیر وہ رڑکی اترے پھر وہاں سے اخیر شب میں میرٹھ پہونچے۔ پس دیکھیئے میں ان کے ریل میں سوار ہونے کا اور میرٹھ جانے کا مخالف نہیں تھا بلکہ گفتگو یہ تھی کہ آپ نے طریق میں غلطی کی۔

پس علماء کو اگر کہیں طالبانِ ترقی پر اعتراض کرتے ہوئے سنا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ترقی کے مخالف ہیں، ان کا مطلب یہ ہے کہ جس طریق سے آپ ترقی کو حاصل کرنا چاہتے ہیں یہ طریق اس کا نہیں ہے ؎

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی ؛ کیں راہ کہ تو میروی بہ ترکستان ست

علماء بتانے والے ہیں

طریق اس کا وہ ہے جو مولوی بتاتے ہیں، خدا اور رسول نے جو بتایا ہے وہ طریقہ ہے۔ مولوی بیچارے تو سرکاری حکم کے منادی کرنے والے ہیں۔ منادی کرنے والے سے اگر کوئی معارضہ اور مناظرہ کرے تو وہ یہی کہے گا کہ میں تو منادی کرنے والا ہوں مجھ سے گلجھپ نہ کرو۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے چپراسی سمن لایا اور اس سے مباحثہ کرنے لگے تو ایسے شخص پر دو جرم قائم ہوں گے ایک تو تعمیل نہ کرنے کا، دوسرے سرکاری آدمی سے مقابلہ کرنے کا۔ پس یاد رکھو کہ یہ علماء سرکاری آدمی ہیں ان سے منازعت کرنا جرم ہے۔

غرض طریق ترقی کا وہ نہیں جو آپ لوگوں نے اختیار کیا ہے ترقی اور عزت حاصل

کرنے کی ضرورت تو مسلم ہے لیکن طریق یہ نہیں ہے۔

اب میں اس کو بیان کرتا ہوں مگر اس کی تحقیق کے لئے اول یہ سمجھئے کہ عزت حاصل کرنے کی غرض کیا ہے اور وہ کیوں ضروری ہے۔ سو لوگ تو ترقی اور عزت کے طالب ہیں کہ اس کی غرض محض بڑا بننا ہے۔ مگر میں اس کی اصل وجہ بیان کرتا ہوں کہ اسکی کس لئے ضرورت ہے۔

انسان کا مقصد

اصل یہ ہے کہ عقلی طور پر انسان کو دو چیزوں کی ضرورت ہے منافع کو حاصل کرنا اور مضرات سے بچنا۔ آدمی جو کچھ کرتا ہے اس کی غایت صرف یہی ہوتی ہے کہ یا تو نفع کی تحصیل ہو یا مضرات کا دفع۔ مثلاً کھانا کھاتا ہے تاکہ بھوک کے ضرر سے بچے اور قوت کی منفعت حاصل ہو۔ دوا کرتا ہے تاکہ مرض دور ہو اور صحت حاصل ہو۔ غرض جو کچھ کرتا ہے یا تو جلب منفعت کیلئے یا دفع مضرت کیلئے، اور دوسرا قاعدہ عقلی یہ سمجھو کہ ضروری چیزوں کے طریقے بھی ضروری ہوتے ہیں۔ پس جلب منفعت اور دفع مضرت جس طریقے سے حاصل ہو وہ بھی ضروری ٹھہرا۔ سو طریقہ اس کا یہ ہے مال وجاہ کا حاصل ہونا۔ مال تو اصل ہیں منافع کی تحصیل کے واسطے ہے اور جاہ اصل میں دفع مضرت کے واسطے ہے، گو کبھی کبھی جاہ سے خطرہ میں بھی پڑنے کا احتمال ہے، لیکن وہ بحیثیت جاہ ہونے کے خطرہ کا سبب نہیں ہوتی اس لئے کہ جاہ فی حد ذاتہ خطرات سے بچانے والی ہے بلکہ سبب وقوع فی الخطرہ کا قلت جاہ ہوتی ہے۔ مثلاً بعض بڑے لوگوں کے کچھ دشمن ہوگئے اور آزار پہونچایا تو یہ ایذا جاہ کے سبب سے نہیں ہوتی بجاہ کے محدود ہونے کی وجہ سے ہے اگر غلبہ پورا ہوتا تو اس کا کوئی کچھ نہ بگاڑ سکتا اسی واسطے حق تعالیٰ کا کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ غلبہ اور عزت غیر محدود اور کامل درجہ میں ہے۔ لیکن تاہم جاہ ہی ایسی شئی ہے جو بہت سے مصائب اور خطرات سے آدمی کو بچاتی ہے۔ مثلاً اب ہم اطمینان سے بیٹھے ہیں، کوئی ہم کو ذلیل نہیں کر سکتا۔ بیگار میں نہیں پکڑ سکتا۔ تو اس کا سبب کیا ہے۔ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عزت عطا فرمائی ہے۔ بخلاف ان لوگوں کے جن کو عزت حاصل نہیں ہے۔ پولیس نے حکم دیدیا کہ دس چماروں کو بیگار میں پکڑ لاؤ، بیچارے چار و ناچار آتے ہیں۔ پس جاہ اور عزت کی غرض مضرت سے بچنا ہے۔

عزت و مال مطلوب ہیں

اس تقریر سے معلوم ہوگیا کہ عزت اور مال دونوں مطلوب اور ممدوح ہیں مہروب عنہ اور مذموم نہیں ہیں اور جو مال وجاہ کی مذمت کرتے ہیں ان کا عنوان تعبیری مختصر ہوتا ہے۔ مقصود و مذمت کرنا جب

مال اور حب جاہ کا ہے اور حب بھی وہ جو حق تعالیٰ کی محبت سے بڑھی ہوئی ہو کر ان کی ہوس میں اللہ تعالیٰ کے حکم بھی پس پشت ڈالدے چنانچہ ارشاد ہے قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ اِقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ سے صاف سمجھا جاتا ہے کہ مذموم اور منہی عنہ نہ مال ہے نہ جاہ اور نہ حب مال اور حب جاہ، بلکہ مال اور جاہ کی حب مضرت ہے۔ جو اللہ کی یاد سے غافل کر دے اور اس کے مقابلہ میں دین کی بھی پروا نہ رہے عزت اور آبرو کی ایسی حفاظت کرے کہ دین رہے یا جائے۔ مگر بات نہ جائے۔

جیسے ایک شخص ریل میں سوار تھے انھوں نے نماز نہ پڑھی اور کہتے تھے کہ میں نے نماز اسلئے نہ پڑھی کہ ہندوؤں کا مجمع تھا اگر ان کے سامنے نماز پڑھتا تو وہ یوں کہتے کہ کیا اٹھک بیٹھک کرتا ہے اور اس سے اسلام کی اہانت ہوتی۔ استغفر اللہ یہ اس شخص کا گمان فاسد تھا اگر وہ نماز پڑھتا تو زیادہ عزت ہوتی

حکایت وزیر بھوپال

ایک وزیر اعظم ریاست بھوپال کی حکایت ہے کہ کسی بڑے حاکم کا لکچر ہو رہا تھا نماز کا وقت آگیا۔ بڑے بڑے امراء وزراء شریک تھے ان میں نمازی بے نمازی سب قسم کے تھے سب یہ سمجھے کہ یہاں سے اٹھنا بڑی سبکی کی بات ہے اس لئے سب ساکت بیٹھے رہے۔ وزیر صاحب نے کھڑے ہو کر کہا کہ حضور نماز کا وقت آگیا ہے ہم نماز پڑھیں گے۔ حاکم نے بہت خوشی سے کہا کہ ضرور پڑھ لیجئے وزیر صاحب کھڑے ہوئے اور لوگ بھی نماز کیلئے کھڑے ہوگئے دربار ہی میں بڑی شان و شوکت سے نماز باجماعت ہوئی۔

دین سے بے رغبتی

دیکھئے عزت یہ ہے، آج کل یہ حالت ہے کہ گو دین جاتا رہے مگر ہماری آبرو و عزت مزعومہ میں فرق نہ آنے پائے۔ ہماری آمدنی میں فرق نہ آنے پاوے، چنانچہ مختلف تدبیروں سے خواہ وہ جائز ہوں یا ناجائز۔ کوئی مال بڑھا رہا ہے، کوئی جائداد کی فکر میں ہے، عورتیں زیور کے بڑھانے کی فکر میں، اسی طرح جاہ کو مختلف تدبیروں سے حاصل کرتے ہیں۔ اور اس کو ریاست سمجھتے ہیں۔ آج کل ریاست کا حاصل کیا ہے کہ اپنے دباؤ اور زور سے غریبوں پر ظلم کرنا کسی کی گھاس چھین لی کسی کی زمین دبالی وغیرہ غرض

عزت کے مقابلہ میں جب دین کی پروا نہ کی تو کیا عزت ہے۔ ہاں یہ بھیڑیئے کی عزت ہے، اگر ابھی بھیڑیا آجاوے تو سب کھڑے ہوجاویں خواہ وہ یہ سمجھے کہ میری تعظیم کو کھڑے ہوئے رحالانکہ لوگ اپنی حفاظت کے لئے کھڑے ہوں (علی محمد) واللہ ان امراء اور ظالموں کو ایسی ہی عزت ہے کہ لوگ اپنے بچاؤ کی وجہ سے ان سے ڈرتے ہیں۔ ورنہ ویسے تو کوستے اور گالیاں ہی دیتے ہیں کہ خدا تعالیٰ اسکو غارت کرے۔

عزت ہے اللہ والوں کی کہ ان کے لئے جان تک فدا کرنے کے واسطے لوگ حاضر ہیں۔ پس حقیقی عزت یہ ہے کہ دلوں پر قبضہ کرے اور دلوں پر سکہ جائے۔ سو ایسی عزت اللہ والونکی ہے۔

(العزۃ ص۱۴۰)

(۲۸) اس تکیہ کلام اور مشہور اعتراض کا جواب کہ فلاں بات خلافِ عقل ہے اسلئے قابل قبول نہیں

ہمارے بھائیوں نے ایک سبق پڑھ لیا ہے کہ جو بات ان کی سمجھ میں نہ آئے کہدیا کہ یہ خلافِ عقل ہے اس لئے قابلِ قبول نہیں اور لگے نصوص میں تحریف و تاویل کرنے۔ چنانچہ ان کے نزدیک صراط پر چلنا بھی خلافِ عقل ہے۔ اور ساری معادیات اور معجزات خلافِ عقل ہیں، تو اسطرح انھوں نے عقائد میں بھی اختصار و انتخاب کرنا شروع کیا اب ایمان کے معنیٰ وہ نہ رہے جو پہلے تھے یعنی تصدیق بما جاء بہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ معنیٰ یہ ہو گئے کہ تصدیق بما وافق عقل مما جاء بہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم، یعنی ان کے نزدیک ایمان کہتے ہیں اس چیز کے ماننے کو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ باتوں میں سے ان کی عقل کے مطابق ہو۔

میں کہتا ہوں کہ یہاں دو مقدمہ ہیں ایک تو یہ کہ جو بات شریعت میں عقل کے خلاف ہے تمہاری عقل کے یا سب عقلاء کی عقل کے۔ دوسری شق تو مسلم نہیں کیونکہ علماء راسخین جن کی عقل کے سامنے اہل دنیا کی عقل کچھ حقیقت نہیں رکھتی وہ انکو خلافِ عقل نہیں کہتے اور ہر زمانہ میں ان مسائل کو ایسی صورت پر تسلیم کرتے آئے ہیں جس صورت سے شریعت میں تعلیم دی گئی ہے۔

چنانچہ حضرات صحابہؓ و تابعین و علماء و صلحاء امت سب ان کا اعتقاد ظاہر کے مطابق رکھتے آئے ہیں۔ اگر یہ کہو کہ تمہاری عقل کے خلاف ہے تو اس صورت میں صغریٰ تو مسلم مگر کبریٰ مسلم نہیں کہ جو تمہاری عقل کے خلاف ہو وہ غلط اور نا قابل قبول ہے کیونکہ قوانین سلطنت میں بہت سی باتیں تمہاری عقل میں نہیں آتی مگر تم قانون دانوں کی عقل پر اعتماد کر کے ان کو تسلیم کرتے ہو۔ اس کو بھی جانے دو۔ میں تمہیں سے پوچھتا ہوں کہ ماں کے پیٹ سے تم جس طرح پیدا ہوئے ہو کیا تمہاری عقل میں آتا ہے۔ واللہ ہم کو اس پر حیرت اسلئے نہیں ہوتی کہ رات دن اس کا مشاہدہ ہو رہا ہے اگر اس کا مشاہدہ نہ ہوتا، اور صرف بیان سے یہ طریقہ معلوم ہوتا تو ہرگز عقل میں نہ آتا۔

انسان کی پیدائش

اس کا امتحان اس طرح ہو سکتا ہے کہ تم ایک نوزائیدہ بچے کی اس طرح نگرانی کرو کہ وہ یہ بات سننے یا دیکھنے نہ پائے کہ بچہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا کرتا ہے۔ اس کے بعد آپ اس کو فلسفہ اور سائنس اور طب سب کچھ پڑھائیں مگر یہ نہ پڑھائیں جس میں طریق تولادت کا ذکر ہو پھر جب وہ بی، اے، اور ایم، اے اور ایل، ایل، بی ہو جائے اس وقت اس سے کہو کہ خبر بھی ہے تو کیونکر پیدا ہوا تھا اور اس سے بیان کرو کہ اول تیرا باپ تیری ماں کے پاس گیا تھا جس سے منی کے کچھ قطرے تیری ماں کے پیٹ کے اندر جو رحم ہے اس میں گرے تھے پھر رحم کے اندر اس کی پرورش ہوئی کہ خون بنا اور خون سے علقہ پھر مضغہ پھر گوشت میں ہڈیاں بنیں پھر جسم کامل تیار ہو گیا تو اس میں روح پڑی جس کی پرورش عرصہ تک خونِ رحم سے ہوتی رہی پھر نو ماہ کے بعد تو شرمگاہ مادر سے نکلا اور اب وہی خون رحم دودھ کی شکل میں ماں کے پستان میں آگیا جس سے دو برس تک پرورش پاتا رہا۔ (الیٰ آخرہ) تو میں سچ کہتا ہوں کہ واللہ العظیم وہ نہایت سختی سے آپ کی مخالفت کرے گا اور کہیگا ایک قطرہ سے ایسے حسین جسم کا بننا پھر اس کا شرمگاہ سے جو نہایت تنگ راستہ ہے نکل آنا عقل کے بالکل خلاف ہے۔

اب بتلائیے کہ اگر یہ قاعدہ مان لیا جائے کہ جو بات جس کی عقل میں نہ آئے وہ غلط ہوا کرے تو پھر آپکا ماں کے پیٹ سے پیدا ہونا بھی غلط ہے بات یہ ہے کہ آپ خلاف عادت کو خلافِ عقل کہتے ہیں جیسے نوزائیدہ بچہ جس کی ایسی نگرانی کی گئی ہو جس کا اوپر ذکر ہوا ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کو خلافِ عقل کہے گا۔ کیونکہ اس نے یہ بات کبھی دیکھی یا سنی نہ تھی اور آپ اس کو خلافِ عقل اس لئے نہیں کہتے کہ آپ کو اس کی عادت ہو گئی، ورنہ آپ بھی وہی کہتے جو وہ کہتا ہے اور ظاہر ہے کہ

خلافِ عقل کا وقوع نہیں ہو سکتا۔

خلاف عادت اور خلاف عقل میں فرق

تو معلوم ہوا کہ آپ خلافِ عقل ایسی باتوں کو بھی کہتے ہیں جن کا وقوع مشاہدہ ہوجاوے تو وہ خلاف عقل نہ رہیں معلوم ہوا کہ آپ دراصل خلاف عادت کو خلافِ عقل کہہ رہے ہیں اور کسی بات کے صحیح ہونے کے لئے خلاف عادت ہونا مضر نہیں اور نہ یہ غلط ہونے کی دلیل ہے۔ ورنہ پھر اس کے لڑکے کے قول کو بھی مان لینا چاہئے جو ماں کے پیٹ سے انسان کے پیدا ہونے کو غلط کہتا تھا۔

اور نیز بہت سی باتوں کو جنہیں آپ چار دن پہلے مستبعد اور محال سمجھتے تھے اور آج ان کا مشاہدہ ہو رہا ہے غلط کہنا چاہئے جیسے ریل کا ایک گھنٹہ میں ۶۰ میل طے کر لینا اور ۵ منٹ میں لندن سے تار کے ذریعہ سے خبر آجانا وغیرہ وغیرہ۔

اس کے علاوہ دنیا میں بہت سے امور عادت کے خلاف ہوتے رہتے ہیں۔ میں نے مرغی کا ایک بچہ دیکھا ہے جس کے چار پیر تھے۔ اور آجکل دہلی میں دو لڑکیاں جڑی ہوئی نمائش میں آئی تھیں جن کے تمام اعضاء جدا جدا تھے مگر کمر جڑی ہوئی تھی اور پیشاب گاہ الگ الگ تھی مگر پیشاب نکلتا ایک کے رستے سے تھا۔

تو بتلائیے کیا خلاف عادت کیلئے بھی کوئی ضابطہ ہو سکتا ہے جس کے اوپر بنا کر کے بعض امور کو مانا جائے اور کسی کے متعلق یہ کہا جاوے چونکہ یہ خلاف عادت ہے اسلئے ہم نہیں مانتے۔

صاحبو! آپ کا عدم سے وجود میں آنا ہی خلافِ عادت ہے۔ کیونکہ عادت کا مقتضیٰ تو یہ ہے کہ ہر شئی اپنی حالت پر رہے جو معدوم ہے معدوم رہے اور جو موجود ہے وہ کبھی فنا نہ ہو۔ مگر رات دن اس کے خلاف مشاہدہ ہو رہا ہے، ہزارہا معدوم وجود میں آتے اور لاکھوں موجود معدوم ہو جاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ کسی بات کا خلافِ عادت ہونا اس کے غلط ہونے کو مستلزم نہیں۔

خلاف عادت اور خلاف عقل میں فرق

اب دوسرا مقدمہ یہ سمجھ لیجئے کہ آپ خلافِ عادت کو خلاف عقل کہتے ہیں اور ان دونوں میں فرق نہیں کرتے حالانکہ یہ بڑی سخت غلطی ہے۔ سنئے میں اس کا فرق بتلاتا ہوں۔ خلاف عادت تو وہ ہے جو عقلاً ممکن ہو مگر مشاہدہ نہ ہونے کی وجہ سے دشوار و مستبعد معلوم ہوتا ہے اور خلاف عقل وہ ہے جو عقلاً ناممکن ہے یعنی عقل کے استحالہ پر دلیل قائم کر سکے اور استحالہ کہتے ہیں

اجتماع نقیضین کو، تو خلافِ عقل وہ ہے جس کے ماننے نقیضین کا ایک محل میں ایک آن میں ایک جہت سے مجتمع ہونا لازم آجائے۔ اب جو لوگ معادیات کو اور صراط کو وزن اعمال وغیرہ کو خلافِ عقل سمجھتے ہیں وہ مہربانی کر کے ان کے استحالہ پر دلیل قائم کریں اور بتلائیں کہ ان کے ماننے سے اجتماعِ نقیضین کیونکر لازم آتا ہے۔ یقیناً وہ ہرگز کوئی دلیلِ عقلی ان کے استحالہ پر قائم نہیں کر سکتے بس بہت سے بہت یہی کہیں گے کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیونکر ہو جائے گا۔ اس کی نظیر دکھلاؤ۔ بس آج کل تمام شبہات کا حاصل یہ ہے کہ اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی اسلئے یہ محال ہے اور جو دعویٰ امکان کا کرتا ہے وہ اس کی نظیر دکھلائے۔ عجب اندھیر ہے کہ نظیر پر ثبوت شئی کو موقوف بتلایا جاتا ہے اور جس چیز کی نظیر نہ ملے اس کو خلاف عقل اور محال کہا جاتا ہے۔ لوگوں کو ثبوت کی حقیقت ہی معلوم نہیں۔ نظیر پر ثبوت کو موقوف سمجھتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ جو صنائع اور عجائبات اس زمانہ میں ایجاد یا مشاہد ہوئے ہیں کیا اس زمانہ سے پہلے کسی کے پاس ان کی نظیر تھی اور اگر نہ تھی تو کیا اس وقت یہ خلافِ عقل اور محال تھیں۔ اگر محال تھیں تو پھر آج ان کا وقوع کیونکر ہوا۔ معلوم ہوا کہ کسی شئی کا امکان نظیر کے ملنے پر موقوف نہیں تو خوب سمجھئے کہ کسی دعویٰ کا ثبوت نظیر کے ملنے پر موقوف نہیں بلکہ نظیر تو محض توضیح اور تنویر کے لئے ہوا کرتی ہے مدعی ثبوت کے ذمہ نظیر کا پیش کرنا ہرگز لازم نہیں خصوصاً ایسے مدعی کے ذمے جو کسی امر کا ثبوت یہ کہکر کرتا ہو کہ یہ امر خلاف عادت بطور معجزہ کے واقع ہو یا قیامت میں خلافِ عادت یوں ہوگا اس ذمہ تو کسی قاعدہ سے بھی نظیر کا پیش کرنا لازم نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ تو اپنے دعویٰ میں تصریح کر رہا ہے کہ مدعا بے نظیری کی صفت کے ساتھ متصف ہے اگر نظیر کا پیش کرنا مدعی کے ذمہ کسی درجہ میں لازم بھی ہو سکتا ہے تو صرف اس مدعی کے ذمہ ہو سکتا ہے جو اپنے دعویٰ کو موافق عادت بتلائے اور جو خرق عادت کا مدعی ہو اس سے نظیر کا مطالبہ کرنا عجیب ہے۔

لوگوں کا موجودہ ذوق

اب میں آپ کو ثبوت کی حقیقت بتلاتا ہوں جس کے نہ ملنے کی وجہ سے لوگوں کا مذاق ایسا بگڑ گیا ہے کہ آج علماء سے معراج کی نظیر کا سوال ہوتا ہے۔ شق القمر کی نظیر کا مطالبہ ہوتا ہے۔ اس لئے یہ عقلی مسئلہ ہے کہ کسی خبر کا صحیح ہونا یا کسی امر کا واقع ہونا نظیر پر ہرگز موقوف نہیں چنانچہ جن کو عقلیات سے کچھ بھی مس ہے وہ اس کو جانتے ہیں مدعی اگر نظیر بیان کر دے تو یہ اس کا تبرع ہے بلکہ ثبوت خبر کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک مخبر بہ کا ممکن ہونا دوسرے مخبر کا صادق ہونا۔ پس ہمارے ذمہ تمام معجزات اور

معادیات کے متعلق دو باتوں کا ثابت کرتا ہے ایک یہ کہ وہ فی نفسہ ممکن ہوں، دوسرے مخبر صادق نے اس کے وقوع کی خبر دی ہو۔ ان دو باتوں کے ثابت کرنے کے بعد کسی کو انکار کا حق نہ ہوگا۔

دینی امور کی دلیل

اب ہم معراج وغیرہ اور صراط و وزن اعمال وغیرہ کے ثبوت پر دلیل قائم کرتے ہیں کہ یہ معجزات اور معادیات فی نفسہ ممکن ہیں۔ یہ تو دلیل کا پہلا مقدمہ ہے اگر کسی کو اس مقدمہ میں کلام ہو تو اس پر لازم ہے کہ ان کے امتناع پر دلیل قائم کرے اور ہم کو امکان پر دلیل قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ امکان کی کوئی علت نہیں ہوتی بلکہ امتناع پر دلیل نہ ہونا یہی امکان کی دلیل ہے اور اوپر معلوم ہو چکا ہے، کہ امتناع کہتے ہیں اجتماعِ نقیضین کو کہ محل واحد میں آن واحد میں جہت واحدہ سے ہو تو جس کو ان امور کے امکان میں کلام ہو وہ ثابت کرے کہ ان میں اجتماع نقیضین کس طرح لازم آتا ہے۔

دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ جس امر ممکن کے وقوع کی خبر کوئی مخبر صادق دے وہ ثابت ہے اور ان معجزات و معادیات کے وقوع کی خبر مخبر صادق نے دی ہے۔ پس یہ امور واقع و ثابت ہیں۔ ان مقدمات میں اگر کوئی کلام کرے تو اس کا جواب ہمارے ذمہ ہے۔ باقی نظیر کا پیش کرنا ہمارے ذمہ نہیں

پل صراط پر چلنا

مثلاً اگر کوئی کہے کہ پل صراط پر چلنا عقل کے خلاف ہے سمجھ میں نہیں آتا تو میں کہوں گا کہ بتلاؤ کیوں سمجھ میں نہیں آتا اس میں کیا استحالہ ہے کہ ایک باریک چیز پر پیر آجائے۔ جب یہ محال نہیں اور مخبر صادق اس کے وقوع کی خبر دے رہا ہے تو پھر انکار کی کیا وجہ، اگر کوئی انکار کرے تو اس کو یہ حق تو ہے کہ امکان کو رد کرے اور امتناع کو ثابت کرے یا دوسرے مقدمہ میں کلام کرے کہ یہ مخبر صادق کی خبر نہیں۔ تو ہم دلیل امتناع سننے کیلئے تیار ہیں اور کلام اللہ کو کلام اللہ ثابت کرنا بھی ہمارے ذمہ ہے اور جب یہ دونوں باتیں ثابت ہو جائیں پھر ہم نظیر پیش کرنے کے ذمہ دار نہیں اور اگر نظیر ہم کو معلوم بھی ہو تب بھی نہ بتلائیں گے کیونکہ یہ ہمارے ذمہ نہیں کہ ہم اپنی سب معلومات آپ کو بتلا دیں۔ ہاں اگر تم یہ ثابت کر دو کہ مستدل کے ذمہ نظیر کا پیش کرنا ضروری ہے تو جب ثابت کر دو گے اس وقت دیکھا جائے گا۔ بدون اس کے ہم زوائد کے ساتھ جواب نہ دیں گے۔ یہ عوام کو زیادہ تر جواب دینے والوں ہی نے خراب کیا ہے کہ وہ ہر بات میں تبرعاً نظیریں بیان کرنے لگے عوام سمجھے کہ یہ بھی مجیب کے ذمہ ہے تو میں اس کا فیصلہ کرتا ہوں کہ مستدل کے ذمہ یہ ہرگز نہیں اور جو دعویٰ لزوم کا کرے وہ دلیل قائم کرے یہ ہے دلیل مطرد جو تمام معجزات و معادیات میں برابر چل سکتی ہے، اور جو دلیلیں آجکل بیان کیجاتی ہیں جن میں زیادہ

تر نظیر سے جواب دیا جاتا ہے وہ مطرد نہیں ہیں۔

کسی واقعہ کا ثبوت نظیر پر موقوف نہیں

اب میں عقلاً یہ بات ثابت کرتا ہوں کہ کسی واقعہ کا ثبوت نظیر پر موقوف نہیں۔ تقریر اس کی یہ ہے کہ یہ ظاہر ہے کہ نظیر بھی ایک واقعہ ہے میں پوچھتا ہوں کہ اس کیلئے بھی نظیر کی ضرورت ہے یا نہیں۔ وعلیٰ ہذا۔ اگر ہر نظیر کے لئے نظیر کی ضرورت رہی تو تسلسل مستحیل لازم آئے گا اور نظیر سے ایک دعویٰ بھی ثابت نہ ہو سکے گا اور اگر جا کر ٹھیر و گے کہ اس نظیر کیلئے کسی نظیر کی ضرورت نہیں تو معلوم ہوا کہ کسی واقعہ کا ثبوت بدون نظیر کے بھی ہو گیا تو پہلے ہی کیلئے نظیر کی کیوں ضرورت ہے۔ اور جس طرح تم نے اخیر میں ایک واقعہ کو بلا نظیر مان لیا تو پہلے ہی کو بلا نظیر کیوں نہیں مان لیتے۔ غرض کسی دلیل سے مستدل کے ذمے نظیر کا بیان کرنا نہیں ہے ہاں اگر بیان کر دے تو یہ اس کی شفقت ہے اور اس کا موقع اس وقت ہے جب کہ سائل دلیل کے مقدمات پر کلام کرنے سے عاجز ہو جائے اور تسلیم کرلے کہ واقعی دلیل سے یہ دعویٰ ثابت ہو گیا اور مجھے اب انکار کا کوئی حق نہیں۔ اس وقت اگر مجیب تقریب فہم کے لئے کوئی نظیر دیدے تو اس کا احسان ہے اور اگر وہ نظر پر ثبوت دعویٰ کو موقوف بتلاتا ہے تو مستدل نظیر ہرگز نہ بتلائے بلکہ اس توقف علی النظیر کی دلیل مانگے۔

پل صراط کیا ہے

چنانچہ اس وقت میں ثبوت پل صراط پر دلیل قائم کر کے اس کی ایک نظیر تبرعاً بتلاتا ہوں۔ اول پل صراط کی حقیقت سمجھئے مگر یہ کہے دیتا ہوں کہ یہ مضمون ظنی ہے اس طور پر پل صراط کو سمجھنا واجب نہیں۔ اصل تو یہی ہے کہ آدمی مجملاً پختہ عقیدہ رکھے باقی بعض طبائع ضعیف ہوتی ہیں۔ ان کے لئے میں یہ مضمون بیان کرتا ہوں اگر وہ اس طرح بھی پل صراط کو سمجھ لیں تو حرج کچھ نہیں مگر لازم بھی نہیں، لازم تو وہی اجمالاً مان لینا ہے۔ اس تنبیہ کے بعد کہتا ہوں کہ اول اس کی حقیقت سمجھو جس کے لئے اول یہ مقدمہ سنو! کہ اس عالم کے سوا ایک عالم اور بھی ہے مسلمان تو اس کا انکار نہیں کر سکتے۔ اور مخالفین اگر انکار کریں تو ہمارے پاس ان کے جواب کے لئے وہی دلیل مطرد ہے جو اوپر مذکور ہوئی کہ دوسرے عالم کا ہونا ممکن ہے کسی کو امکان پر کلام ہو تو دلیل امتناع قائم کرے اور جس ممکن کی خبر مخبر صادق نے دی ہو وہ ثابت ہے۔ پس دوسرا عالم ثابت ہے اور مخبر کے صادق ہونے کو ہم دلائل سے ثابت کر سکتے ہیں۔

دنیا میں اختلاف حالات

دوسرا مقدمہ سنئے کہ عالم کے اختلاف سے بعض احکام اور حالات بدل جاتے ہیں، اس کی بھی دلیل تو وہی ہے جو مذکور ہوئی اور تقریب فہم کے لئے ایک نظیر بھی بتلاتا ہوں جیسے اقالیم کے بدلنے سے بھی دنیا ہی میں حالات بدل جاتے ہیں مثلاً یہاں اس وقت رات ہے اور ایک اقلیم میں اس وقت دن ہے یہاں آجکل گرمی ہے اور کسی اقلیم میں اس وقت سردی ہے وعلیٰ ہذا چوبیس گھنٹے کا دن رات ہے اور بعض اقالیم میں چھ مہینے کا دن اور چھ مہینے کی رات ہے، اور یہیں سے معلوم ہوا ہوگا کہ قرآن میں جو آیا ہے کہ عالم آخرت کا ایک دن ہزار برس کے برابر ہے اور اس پر بعض لوگ ہنستے ہیں تو یہ انکی حماقت ہے اس میں استبعاد کیا ہے جب عالم دنیا ہی میں اقلیم کے بدلنے سے یہ بات مشاہد ہے کہ بعض جگہ چھ ماہ کا دن ہوتا ہے تو اختلاف عالم کے بعد عالم آخرت میں اگر ہزار برس کے برابر ایک دن ہو تو کیا تعجب ہے۔

تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ اختلاف کی کوئی حد نہیں ہے نہ یہ منضبط ہو سکتا ہے۔ یہ مقدمہ بدیہی ہے محتاج دلیل نہیں۔ اور جو شخص کسی حد پر انتہاء اختلاف کا دعویٰ کرے اور اس سے آگے اختلاف ہونے کو ممتنع کہے وہ اس پر دلیل قائم کرے۔

چوتھا مقدمہ یہ ہے کہ ممکن ہے کہ جو چیز یہاں عرض ہو اس عالم میں جاکر جوہر ہو جائے اس کا ممکن ہونا بھی ظاہر ہے یہ تو مسلم ہے کہ ایک آن اور ایک محل میں شئے واحد عرض وجوہر نہیں ہو سکتی مگر یہ ہو سکتا ہے کہ ایک شئ یہاں عرض ہو اور دوسری جگہ جوہر ہو جائے اس کے امتناع پر کوئی دلیل قائم نہیں۔ اگر کسی کے پاس دلیل ہو پیش کرے اور استیناس کے طور پر اس کو یوں سمجھے کہ اس زمانہ میں بعض آلات کے ذریعہ سے حرارت و برودت وغیرہ کا وزن ہوتا ہے حالانکہ پہلے حکماء ان کو مقولۂ کیف سے سمجھتے تھے جس کے لئے وزن اور مقدار نہیں ہو سکتی مگر اس زمانہ میں ان کے لئے وزن ہونا ثابت ہو گیا۔ اس لئے میں تو کہا کرتا ہوں کہ جتنی یہ نئی نئی ایجادات ہیں سب معادیات کے سمجھنے کیلئے معین ومُمد ہیں چنانچہ گراموفون ہاتھ پیر کے بولنے پر بڑی دلیل ہے کیونکہ گراموفون میں تو روح بھی نہیں اور کلام کرتا ہے تو اعضاء انسانی کے بولنے میں کیا تعجب جن میں حیات کا تلبس ہے۔

ایک حدیث کی تشریح

اسی طرح ایک حدیث میں ہے جو نسائی میں موجود ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صلوٰۃ کسوف کے موقعہ پر فرمایا کہ میں نے مسجد کی دیوار کے قریب جنت ودوزخ کو دیکھا۔ بعض لوگ اس پر ہنستے تھے کہ جنت ودوزخ تو آسمان

وزمین سے بڑی بتلائی جاتی ہے حضور نے انکو دیوار پر کیونکر دیکھ لیا اور اصلی حالت پر کیسے دیکھ لیا۔ مگر خدا تعالیٰ نے فوٹو اور خوردبین کو ایجاد کرا کے اس استبعاد کو دور کرایا۔ فوٹو میں بڑی سے بڑی شے کو چھوٹا کر کے دکھایا جا سکتا ہے اور خوردبین سے چھوٹی سے چھوٹی چیز پہاڑ بنا کر دکھائی جا سکتی ہے تو خدا تعالیٰ کو یہ قدرت نہیں کہ اس نے جنت ودوزخ کا فوٹو مسجد کی دیوار پر اتار دیا ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شعاع میں خوردبین کی قوت رکھ دی ہو جس سے فوٹو کی چھوٹی چیزیں آپ کو اصلی حالت پر نظر آ گئی ہوں اور حدیث میں یہی لفظ وارد ہے امثلت لی الجنۃ والنار، فرمایا کہ جنت ودوزخ زمین میں اتر آئی تھیں بلکہ آپ نے یہ فرمایا کہ وہ میرے لئے ممثل ہو گئیں۔ اسی لئے جب کوئی نئی ایجاد ہوتی ہے تو میں خوش ہوتا ہوں۔ کیونکہ ان سے شرعیات کا استبعاد دور ہوتا جاتا ہے چنانچہ ایک عجیب بات اس زمانہ میں یہ ہے کہ آجکل حرارت و برودت کا بھی وزن ہونے لگا ہے کہ اس مکان میں کس قدر وزن کی حرارت موجود ہے اور کس درجہ کی برودت ہے اور بخار میں تھرمامیٹر سے مریض کی حرارت کا وزن کیا جاتا ہے۔ اب اگر کسی گنوار سے کہئے کہ گرمی بھی تلتی ہے تو اسکو کتنا تعجب ہوگا۔

تو جب دنیا ہی میں بعض اعراض کا وزن ہونے لگا جس کی حقیقت ہے آلۃ الوزن کے انخفاض اور ارتفاع سے مقدار کا معلوم ہو جانا جو کہ سرسری نظر میں خواص جوہر سے ہے تو اگر دوسرے عالم میں جا کر وہ جوہر ہی بن جاوے تو کیا تعجب ہے۔ اور لیجئے۔ اگر ایک برتن ٹھنڈا پانی بھر کر وزن کرو تو اور وزن ہوگا اور اسی میں گرم پانی بھر کر وزن کرو تو اور وزن ہوگا۔ آخر کمی بیشی کیوں ہے پانی کی مقدار دونوں حالتوں میں یکساں تھی۔ معلوم ہوا کہ برودت وحرارت کا بھی کچھ وزن ہے۔ اب خواہ اس کو یوں تعبیر کر لیجئے کہ وزن پانی ہی کا ہے مگر بشرط برودت وحرارت کے آخر ان کو وزن میں دخل تو ہوا۔ تو اس عالم میں اگر یہی دخل درجہ موزونیت میں اس طرح ہو جائے کہ یہ عرض جوہر بن جاوے تو کیا تعجب ہے۔

اور سنئے! اطباء کہتے ہیں کہ جس شخص میں صفراء کا غلبہ زیادہ ہو وہ خواب میں آگ بہت دیکھتا ہے۔ دیکھئے جو چیز یہاں عرض تھی یعنی حرارت صفراوی وہ عالم خیال میں آگ بن گئی جو کہ جوہر ہے پس اس عالم میں عرض کا جوہر بن جانا کچھ بعید نہیں۔

اب پل صراط کی حقیقت سمجھئے گو اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ مسلمان کا مذاق تو یہ ہونا چاہئے۔ ؎

حدیث مطرب دمے گو وراز دہر کم ترجو ؛ کہ کس نہ کشود ونہ کشاید بہ حکمت ایں معمار

اور میں کہہ چکا ہوں کہ میرے ذمہ اس کا بیان کرنا لازم نہیں، میرے ذمہ تو وہی تھا جو میں بیان کرچکا ہوں مگر اس میں حظ نہ آیا تھا، اس لئے تبرعًا بیان کرتا ہوں کہ خیر جس طرح بھی کام چلے اچھا ہے۔

شریعت پر عمل

تو سنئے! پل صراط کی حقیقت شریعت ہے (کما قال اصحاب الکشف من العرفاء) پس دنیا میں پل صراط کی نظیر شریعت موجود ہے اتنا فرق ہے کہ یہاں یہ عرض ہے اور وہاں جاکر جوہر بن جائے گی، باقی ان تمام صفات میں یہ اس کی نظیر ہے جیسے وہ بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے جس پر چلنا دشوار ہے۔ اسی طرح طریق شریعت نہایت باریک اور نازک ہے جس پر استقامت کے ساتھ چل لینا ہر ایک کا کام نہیں کیونکہ شریعتِ مقدسہ مرکب ہے علم وعمل سے تو اس پر چلنے کیلئے دو قوتوں کی ضرورت ہے ایک قوت علمیہ کی، دوسری قوتِ عملیہ کی۔ قوت علمیہ کا تعلق عقل سے ہے اور قوت عملیہ کا ارادہ سے۔ پھر عمل بعض مفید ہیں اور بعض مضر تو اس میں کہیں تو جلب منفعت کی ضرورت ہے اور کہیں دفع مضرت کی اور جو ارادہ جلب منفعت سے متعلق ہو اس کو قوت شہویہ کہتے ہیں اور جو دفع مضرت کے متعلق ہو اس کو قوت غضبیہ کہتے ہیں تو شریعت پر چلنے کیلئے تین قوتوں کی ضرورت ہوئی۔ قوت [1] عقلیہ، قوت [2] شہویہ، قوت [3] غضبیہ۔

یہی اصول اخلاق کہلاتے ہیں۔ پھر ان میں سے ہر ایک کے تین درجے ہیں۔ افراط، تفریط اور توسط۔ اور شریعت نام ہے توسط کا۔ شریعت میں افراط عقل سے کام نہیں چلتا نہ تفریط سے کام چلتا ہے بلکہ توسط کی ضرورت ہے جس کا نام حکمت ہے اور قوت عقلیہ کا نام جزیرہ ہے یہ نہایت مضر ہے۔ جب عقل بہت بڑھ جاتی ہے تو ہر چیز میں احتمالات عقلیہ پیدا ہونے لگتے ہیں جس سے آدمی وہمی ہوجاتا ہے جیسے اہل فلسفہ میں ایک فرقہ لاادریہ مشہور ہے کہ وہ کسی حقیقت کا وجود تسلیم نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ہم ایک چیز کو دور سے دیکھ کر آدمی سمجھتے ہیں اور وہ گدھا نکلتا ہے۔ بہت لوگ ایک شخص کو حسین سمجھتے ہیں اور بہت سے اس کو بدصورت سمجھتے ہیں۔ بعض لوگ ایک چیز کو میٹھا بتلاتے ہیں اور بخار والا اس کو کڑوی بتلاتا ہے اسی طرح مسائل عقلیہ میں کوئی ایک دلیل کو صحیح کہتا ہے کوئی غلط۔ تو جب ہمارے حواس ظاہرہ اور باطنہ میں اتنا اختلاف ہے اور کبھی ان سے غلطی بھی ہوجاتی ہے، تو یہ کیا اطمینان ہے کہ جس کو ہم نے آدمی سمجھا ہے وہ آدمی ہی ہے گدھا نہیں اور جس کو ہم زمین سمجھتے ہیں وہ زمین ہی ہے آسمان نہیں۔ ممکن ہے ہماری نظر نے غلطی کی ہو۔

بس ان کا یہ حال ہوگیا کہ ہر بات میں ان کو شک ہے اور شک میں بھی شک ہے

فهو شاك وشاك فى انه شاك۔

عقل کی مثال

تو حضرت یہ عقل جب بڑھتی ہے تو اتنا پریشان کرتی ہے کہ زندگی تباہ کردیتی ہے اور یہی وجہ ہے بہت سے عقلاء کے تباہ ہونے کی، کہ انھوں نے عقل سے وہ کام لیا جو اس کی حد سے آگے تھا اور ہر چیز کا اپنی حد سے آگے نکل جانا مضر ہے۔

میں تو عقل کے متعلق ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ یہ ایسی ہے جیسے گھوڑا پہاڑ پر چڑھنے والے کے لئے۔ اب تین قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ جو گھوڑے پر سوار ہوکر پہاڑ تک پہونچے اور پھر پہاڑ پر بھی اس پر سوار ہوکر چڑھنے لگے یہ غلطی پر ہیں۔ ضرور کسی سیدھی اور چڑھائی پر سوار اور گھوڑا دونوں گریں گے، اور ایک وہ ہیں جو یہ سمجھ کر کہ گھوڑا پہاڑ پر تو کام دیتا ہی نہیں تو اس سے صاف سڑک پر بھی کام لینے کی کیا ضرورت ہے وہ گھر ہی سے پیدل چل پڑے، نتیجہ یہ ہوا کہ پہاڑ تک پہونچ کر تھک گئے یہ بھی نہ چڑھ سکے تو ان دونوں کی رائے غلط تھی۔ پہلی جماعت نے گھوڑے کو ایسا با کار سمجھا کہ آخیر تک اسی سے راستہ طے کرنا چاہا اور دوسرے نے ایسا بیکار سمجھا کہ پہاڑ تک بھی اس سے کام نہ لیا۔ صحیح بات یہ ہے کہ گھوڑا پہاڑ تک تو کارآمد ہے اور پہاڑ پر چڑھنے کے لئے بے کار ہے اس کے لئے کسی اور سواری کی ضرورت ہے۔ یہی عقل کا حال ہے کہ عقل سے بالکل کام نہ لینا بھی حماقت ہے اور اخیر تک کام لینا بھی غلطی ہے۔

پس عقل سے اتنا کام تو لو کہ توحید ورسالت کو سمجھو اور کلام اللہ کا کلام اللہ ہونا معلوم کرلو۔ اس سے آگے فروع میں عقل سے کام نہ لینا چاہئے، بلکہ اب خدا اور رسول کے احکام کے آگے گردن جھکا دینی چاہئے، بلکہ اب خدا اور رسول کے احکام کے آگے گردن جھکا دینی چاہئے چاہے انکی حکمت عقل میں آوے یا نہ آوے۔

قانونِ سلطنت کیوں مانتے ہیں

دیکھئے قانون سلطنت کے منوانے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ پہلے یہ سمجھا دیا جاوے کہ جارج پنجم بادشاہ ہے۔ اس کے بعد تمام احکام کے متعلق یہ کہہ دیا جاوے کہ یہ بادشاہ کے احکام ہیں اسلئے ماننا پڑیں گے تو یہ صورت آسان ہے اور تمام عقلاء ایسا ہی کرتے ہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ایک شخص جارج پنجم کو بادشاہ مان کر پھر بھی ہر قانون میں الجھنے لگے کہ میں اس دفعہ کو نہیں مانتا۔ تو بتلائیے اس شخص کا کیا حال ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ہر جگہ ذلیل ہوگا اور عقلاء کہیں گے کہ جب بادشاہ کا بادشاہ ہونا مسلم اور اس قانون کا قانون سلطنت